فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	دورد شریف کا مطلب	نصرت محمود قریشی	8
قولِ نبیؐ	مرحوم والدین کے حقوق	محمد سلیم جلالی	10
خاص مضمون	مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی صورتحال	شمیم سیال/ عائشہ عثمان	14
حالات حاضرہ	ملالہ اور نبیلہ	خدیجہ علی	19
نوائے شوق	غزل	کرامت بخاری	22
	غزل	شمیم فاطمہ	22
حقیقت وافسانہ	لائحہ عمل	قانتہ رابعہ	23
	یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی.....	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	26
	رشّو کی نانی	صبیحہ نبوت	31
سلسلہ وار کہانی	مونالیزا	نصرت یوسف	35
انشائیہ	الشافی کلینک	ربیعہ ندرت	41
میری لائبریری سے	کلامِ مینا	قانتہ رابعہ	47
	قندیلِ روشن	رشیدہ صدف	50
خفتگانِ خاک	نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار	افشاں نوید	54
ملاقات	ڈاکٹر شگفتہ نقوی سے ایک ملاقات	آسیہ راشد	57
روداد	بقلم خود، بقدم خود	فرحت طاہر	68
نہاں خانۂ دل	اجڑا گھر	شاہدہ اکرام	70
غذاوصحت	جب مجھے جونک چمٹ گئی	فریدہ خالد	72
بتول میگزین	عظمیٰ عمران، رافعہ صلاح الدین، حیا قاسمی		75
منتخب کالم	ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے نام	انصار عباسی	78
گوشۂ تسنیم	ﷺ	بشریٰ تسنیم	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! دبے پاؤں آتی بہار کی آہٹ دریچوں تک آ پہنچی ہے۔ دلوں کے دریچوں پر بھی بہاریں دستک دیا کرتی ہیں اور انہیں بند پا کر لوٹ جاتی ہیں۔ دستِ بہار کی انگلیاں فگار ہوں تو ہوں، کون یہ روزن کھولے! اور یہ دستِ بہار بھی عجب کرشمے کرتا ہے۔ کہیں زخم کھولتا ہے کہیں بھرتا ہے۔ کہیں نئے امکانات کے در وا کرتا ہے تو کہیں پرانے کھاتے نئے سرے سے کھول کے رکھ دیتا ہے۔

روز خوشبو تری لاتے ہیں صبا کے جھونکے
اہلِ گلشن مری وحشت کو ہوا دیتے ہیں
سُوئے صحرا بھی ذرا اہلِ خرد ہو آؤ
کچھ بہاروں کا پتا آبلہ پا دیتے ہیں

تابشؔ دہلوی

ربیع الاوّل کا مہینہ اگرچہ ملک بھر میں سیرت النبیؐ کے تذکرے اور حبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مظاہر کے ساتھ گزارا جاتا ہے مگر اس بار ۱۲ ربیع الاوّل کو ''عید میلاد النبیؐ'' کے نام سے سرکاری سطح پر منایا گیا۔ بجلی کے بحران کے اس دور میں شہروں میں بے حساب چراغاں کیا گیا، میڈیا پر بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سالگرہ'' کے اس دن کو عید کی طرح حیثیت دی گئی۔ اوّل تو تاریخ نگاروں کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل ولادتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی متفق تاریخ نہیں ہے۔ مزید برآں بعض سیرت نگار اسی تاریخ کو تاریخِ وفات بھی قرار دیتے ہیں۔ دوم، نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ نے کبھی کسی دن کو یومِ ولادتِ نبیؐ یا سالگرہ کے طور پر نہیں منایا۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جن کی محبت میں ہم یہ دن مناتے ہیں، انہوں نے واضح طور پر فرمایا کہ مسلمانوں کی صرف دو عیدیں ہیں۔

اپنے نبی کی سالگرہ منانے کا یہ کام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے کیا اور نہ صرف کرسمس کے نام پر اپنے تہوار کی بنیاد رکھی بلکہ سارے دین کی اصلی شکل کو مسخ کر دیا۔ ان کی اسی نااہلی کی بنا پر اللہ نے بنی اسماعیلؑ سے نبی عربیؐ کو مبعوث فرمایا اور اُنؐ کے دین میں نئی بات نکالنے کو شدید گمراہی اور عذابِ جہنم کا موجب قرار دیا تاکہ یہ دین اپنی اصل شکل میں قیامت تک انسانیت کی ہدایت کے لیے موجود رہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے جس دو قومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی وہ اپنی تمام گروہی، نسلی، لسانی، علاقائی اور فرقہ وارانہ رنگا رنگی کے باجود محض ایک دین کے پرچم تلے اکٹھا ہونے کا نام تھا۔ ان اختلافات کو ہم جتنی ہوا دیں گے اتنا ہی ہمارا دین کا رشتہ کمزور ہوگا اور ہماری صفوں میں انتشار پیدا ہوگا۔ اگر یہ درست ہے تو پھر یہ بات قومی یکجہتی کے لیے کیسے فائدہ مند ہو سکتی ہے کہ حکومت ایک فرقے کے ایسے عقیدے کو رواج دے جسے عوام کی ایک کثیر تعداد بدعت قرار دیتی ہے۔

ملک اس وقت اندرونی و بیرونی سازشوں اور حکومتی نااہلی کے باعث جس مشکل صورت حال سے دوچار ہے اس میں حکومت اور میڈیا کی جانب سے ایسے اقدامات مزید انتشار کا سبب بن سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایوانِ حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارا میڈیا بھی ایسے لوگوں سے پٹا پڑا ہے جو پاکستان کو نقصان پہنچانے والے بیرونی ایجنڈوں پر کام کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو جان ہتھیلی پر رکھے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں مگر ان کی تعداد

بے حد کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین اور وطن کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کے شر سے بچائے آمین۔

اس ماہ کی دہشت گردی چودھری اسلم کی شہادت سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد بنوں، آر اے بازار اور پھر کوئٹہ کے بعد حملوں، دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حالات سدھرتے نظر نہیں آتے۔ طالبان کے نام پر کون کون سی قوتیں ہیں جو دہشت کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں جب تک یہ واضح نہیں کیا جاتا اس دہشت گردی کا سرا ہاتھ نہیں آ سکتا۔ ''کراچی طالبان'' دراصل کون ہیں اور فرقہ واریت کے پردے میں کون چھپا ہوا ہے، امریکی مفادات سے ہٹ کر ان کا سراغ لگانا ضروری ہے مگر اس کے لیے جو جرأت درکار ہے وہ ان حکمرانوں سے بعید ہے۔ طالبان سے مذاکرات کا عمل نتیجہ خیز بنانے کے لیے بھی نیت اور ارادہ شرط ہے۔ مولانا سمیع الحق کا مذاکرات کے عمل سے نکل آنا بہت سے شکوک وشبہات کو جنم دے رہا ہے۔ حالات کی درستی کے لیے حکومتی نااہلی عیاں ہو چکی ہے۔ موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں جب تک ہم اپنی سمتِ سفر درست نہیں کریں گے اور قومی پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں نہیں لائیں گے، مسائل کا حل ممکن نہیں ہوگا۔

ایک خبر کے مطابق بھارت عورتوں سے زیادتی کے اعتبار سے دنیا کا بدترین ملک قرار پا چکا ہے۔ اقوام متحدہ نے اپنی ایک رپورٹ میں اس حوالے سے بھارت میں عورتوں کی حالت کو تشویش ناک قرار دیا ہے۔ متعدد ملکوں نے اپنے سیاحوں کو بھارت جانے کے معاملے پر وارننگ دی ہے۔ نئی دہلی کو ''ریپ کیپٹل'' کہا جا رہا ہے اور عورتوں کے ساتھ زیادتی ایک قومی مسئلہ بن چکی ہے۔ اس خبر کو بھارتی فلم انڈسٹری بالی وڈ کے اثر ورسوخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ خبر کچھ اچنبھا نہیں لگتی۔ گزشتہ بیس برسوں میں بالی وڈ کی فلموں اور گانوں نے جس طرح عورت کو جنس بازار بنا کر پیش کیا ہے اس کے بعد بھارت کی گلیوں میں عورت کیسے محفوظ رہ سکتی ہے! یہ ایسی فلمیں ہیں جن کا ہر منظر دعوتِ گناہ دیتا ہوا اور ہر بول اخلاق و کردار کا جنازہ نکال دینے والا ہے۔ طالب علموں اور تحقیق نگاروں کی توجہ کے لیے بھارت میں عورتوں کے عدم تحفظ کا یہ گراف اور بھارتی چینلز اور فلم انڈسٹری میں عورت کا جو امیج دیا جا رہا ہے، ان دونوں کا باہم تعلق ایک اہم موضوع ثابت ہوگا۔

المیہ یہ ہے کہ یہی فحش مواد اپنی پوری گندگی کے ساتھ اب پاکستان کے بھی ہر گھر میں دیکھنے اور دکھانے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کئی پرائیویٹ ٹی وی چینلوں نے عریاں اور اخلاق سوز بھارتی شوز اور فلموں کی لت اپنے ناظرین کو ڈالی۔ پھر سینما گھروں میں بھی اس گندگی کی نمائش شروع ہوگئی۔ بے حیائی کا یہ طوفان جس نے بھارتی معاشرے میں عورت کے ساتھ زیادتی کو قومی مسئلہ بنا دیا ہے، اب پاکستان کا رخ کر چکا ہے۔

پیمرا کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں دائر کردہ کیس پر عدالت کا حکم تھا کہ پیمرا، مدعی اور چینل مالکان تینوں فریق بیٹھیں اور میڈیا پر فحاشی کی شکایات دور کرنے کا طریقِ کار وضع کریں۔ مگر پیمرا کی جانب سے اس حکم پر عمل درآمد کا ہنوز انتظار ہے۔ دوسری طرف سپریم کورٹ میں پیمرا پر میڈیا کی بے لگامی کے خلاف چلنے والے کیس کا تاحال کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اس لیے کہ پیمرا کو ''فحاشی'' کی تعریف ہی نہیں مل رہی! کیا بھارت میں بنت حوا کے عدم تحفظ کی یہ صورت حال بھی ان کو فحاشی کا مطلب سمجھانے سے قاصر ہے؟ افسوس کہ بھارتی مواد سے ملنے والے چند ٹکوں کے عوض وہ اپنی مسلمان ماؤں بہنوں بیٹیوں کی حفاظت داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہیں۔

دولت پور میں سکول وین کے حادثے نے کئی معصوم پھولوں کو روند ڈالا۔ اللہ لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

دعاؤں میں یاد رکھیے

صائمہ اسما

☆☆☆☆☆

درود شریف کا مطلب

جب بھی ربیع الاول کا مبارک مہینہ آتا ہے گھر گھر میلاد کی محافل سجتی ہیں اور ہم درود شریف پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ درود شریف ہے کیا؟

جی ہاں درود شریف وہی درود ابراہیمی ہے جو ہم ہر نماز میں پڑھتے ہیں اور جس کے الفاظ نبی کریمؐ نے صحابہ کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ وہ سوال صحابہ کرامؓ نے سورہ احزاب کی آیت نمبر 56 نازل ہونے پر کیا تھا۔ پہلے ہم اس آیت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ بعد میں سوال اور جواب کے بارے میں بات کریں گے۔ سورہ احزاب کی آیت یہ ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا

اس آیت میں دو الفاظ وضاحت طلب ہیں۔

پہلا لفظ یُصَلُّوۡنَ ہے جو جمع کا صیغہ ہے۔ لفظ صَلَّ سے نکلا ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ عربی زبان میں ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ اسی طرح لفظ صَلَّ کے بھی بہت سے مطالب ہیں جنہیں ابنِ اعرابی نے لغت ''لسان العرب'' میں بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق: صَلّ کے لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہے، رحمتیں اور برکتیں نازل فرمانا، جیسے قرآن کی ایک آیت ہے۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ وَّ رَحۡمَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ جن پر ان کے رب کی برکات اور رحمتیں ہیں۔''

اگر صَلَّ کے لفظ کی نسبت مخلوقات کی طرف ہو تو (یعنی انسان اور فرشتے) تو اس کا مطلب ہوتا ہے تعریف کرنا، استغفار کرنا، قیام، رکوع، سجود کرنا، دعا کرنا اور تسبیح کرنا۔ جیسے سورہ بقرہ کی آیت 43 ہے،۔ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ یا نماز (قیام، رکوع، سجود، دعا، تسبیح) قائم کرو۔ سورہ توبہ کی آیت 103 میں صَلِّ کا لفظ تعریف، استغفار اور دعا کے معنوں میں آیا ہے۔ وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ اللہ تعالیٰ نبی کریمؐ سے فرماتے ہیں مومنوں کے بارے میں: اور ان کے لئے دعا کرو، استغفار کرو۔ یقیناً

تمہاری دعااوراستغفاران کے لئےتسکین کاباعث ہے۔

اگر پرندوں اور چوپایوں کی طرف صَلّٰ کی نسبت ہوتو مراد ہے تسبیح کرنا۔ جیسے سورہ نور کی آیت 41 ہے۔وَالطَّيْرُ صٰفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ'' اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی۔ ہر ایک اپنی صلاۃ اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔'' دوسرا تشریح طلب لفظ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

سَلِّمُوْا لفظ سَلَّمَ سے ہے۔ اورامر (حکم) کا صیغہ ہے۔جس کا مطلب ہے، فرمانبردار بن جاؤ، تسلیم کرو اور فیصلہ کرو۔ عام طور پر قرآن حکیم کے اردو تراجم میں سَلِّمُوْا تسلیما کا معانی ''انؐ پر سلام بھیجو۔'' کر کے کیا گیا ہے۔ایک انگریزی کا ترجمہ جو شاہ فہد ہولی پرنٹنگ پریس سعودی عرب کا چھپا ہوا ہے اس کے مطابق ترجمہ یوں ہے۔

''And salute him with all respect''

''اور اُنؐ کو پوری عزت کے ساتھ سیلوٹ کرو۔''

انگریز کے لفظ سیلوٹ کو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کو آپ سیلوٹ کرتے ہیں اس کے کسی حکم کو چیلنج نہیں کر سکتے۔اور ہر حال میں اس کا حکم ماننا آپ پر فرض ہے۔

علامہ محمد اسد نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

And give yourselves up (to his guidance)in utter self-surrender.

''اوراپنے آپ کو پوری پوری خودسپردگی کے ساتھ اُنؐ کی (رہبری اور ہدایات) کے حوالے کردو۔''

الفاظ کی یہ تشریح اس لیے ضروری تھی کہ ہمیں سورہ احزاب کی آیت 56 کا ترجمہ پوری طرح سمجھ میں آجائے۔

اب ان تشریحات کی روشنی میں اس آیت کا مطلب یہ ہوا۔

''یقیناً اللہ تعالیٰ نبی کریمؐ پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتا ہے اور فرشتے ان کی تعریف کرتے ہیں، ان کے لیے دعا واستغفار کرتے ہیں۔تو اے ایمان لانے والو! اُنؐ کی تعریف کرو اور پوری طرح سے اُنؐ کے فرمانبردار بن جاؤ۔ ان کی ہر بات پوری طرح تسلیم کرو اور اُنؐ کا ہر فیصلہ مانو۔''

یہاں میں ایک چھوٹی سی مثال دوں گی کہ آپ کے استاد کو کیمبرج یا ہارورڈ یونیورسٹی نے ڈگری اور تعریفی اسناد دی ہیں تو آپ اس استاد کی بات کو بے چون وچرا مان لیں گے کہ یہ تو Certified Scholar ہے۔کیا ہم اس خیر البشر کی باتوں کو اس طرح تسلیم

کرتے ہیں جس کو رب العالمین نے ڈگری اور تعریفی اسناد دی ہیں؟ کیا ہم اس کا حق ادا کرتے ہیں؟ شاید نہیں!

جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا (بخاری شریف کی احادیث 1907، 1908 اور 1909 کے مطابق) ''اے اللہ کے رسولؐ تسلیم کا فرمانبرداری کا فیصلہ ماننے کا تو ہمیں پتہ ہی ہے۔ یہ صلوٰۃ ہم کیسے پڑھیں؟ تو نبی کریمؐ نے جواب میں درود ابراہیمی بتایا۔''

اب صحابہؓ کی تسلیم و فرمانبرداری میں تو کوئی شک نہیں وہ اطاعت بھی کرتے تھے اور ایک درجہ بڑھ کر اتباع بھی۔ اب جو الفاظ نبی کریمؐ نے اپنی امت کو پڑھنے کے لیے بتائے وہ نہایت محتاط کہ افراط ہو نہ تفریط اور نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا: ''اے اللہ! تو محمدؐ پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرما (تو جانتا ہے جس تعریف کے وہ لائق ہیں اس کے مطابق ان پر رحمتیں نازل فرما) اور آل محمدؐ پر بھی (ان کی تعریف جس کے وہ لائق ہیں کے مطابق) رحمتیں نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیمؑ اور ان کی آل پر رحمتیں نازل فرمائیں۔ یقیناً ہر طرح کی تعریف کے قابل تیری ہی ذات ہے۔ اور ہر طرح کی بڑائی، عظمت، بزرگی (مجد) والی بھی تیری ہی ذات ہے۔ اور اے اللہ! محمدؐ پر اور اُنؐ کی آل پر برکت نازل فرمائی۔ یقیناً **حمیدٌ مجیدٌ** تعریف کے قابل، بزرگی، عظمت، بڑائی والی صرف تیری ہی ذات ہے۔''

اگر ہم سوچیں کہ آخر اللہ تعالیٰ کو کیوں یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ مومنوں کو نبی کریمؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کے لیے کہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ہم کسی بندے کی اچھائیوں کا اعتراف کریں گے تو ہی اس کی باتوں پر عمل کریں گے۔ نبی آخر زماںؐ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام اور انسانیت کے لئے ایک آخری شریعت دے کر بھیجے گئے تھے۔ اب نہ کوئی پیغمبر آئے گا اور نہ کوئی شریعت۔ انہوں نے تہذیب و تمدن میں جتنا بڑا اور گہرا انقلاب برپا کیا اس تہذیب و تمدن پر اللہ تعالیٰ نے انہیں فائز کیا تا کہ رہتی دنیا تک انسانیت ان کی اطاعت و اتباع کر سکے۔ اور اللہ کی وہ نعمتیں سمیٹ سکے جو اللہ نے ان کے لیے مسخر کی ہیں۔ سورہ آلِ عمران میں آیت 31 میں فرمایا۔ ''**قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ** اے اللہ کے نبیؐ کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو۔ تو میری پیروی (اتباع) کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔''

اس اللہ کے بندےؐ نے ہم تک اسلام کی تعلیمات پہنچانے کے لئے بے حد مشکلات اٹھائیں۔ نبی کریمؐ نے ایک دفعہ فرمایا ''میں سب سے زیادہ آزمائشوں میں ڈالا گیا ہوں۔'' انہیں دنیا کا سب سے بڑا سچ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کہنے پر پتھر مارے گئے۔ پاگل، جادوزدہ، سکھایا پڑھایا ہوا جیسے بہتان لگائے گئے۔ قتل کرنے کی سازشیں بارہا کی گئیں۔ جادو کر کے تکلیف میں مبتلا کیا گیا۔ اپنے گھر مکہ سے نکال دیا گیا۔ شعب ابی طالب میں تین سال تک سوشل بائیکاٹ کیا گیا۔ عرب کا بادشاہ بنانے کا، خوبصورت خواتین پیش کرنے اور نہ جانے کون کون سا لالچ دیا گیا۔ لیکن اُنؐ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ تو اے ایمان لانے والو! ہم تو اُنؐ کی ذلت پر قربان ہو جائیں۔ تب بھی حق ادا نہ کر سکیں۔ چہ جائیکہ صرف میلادؐ کی محفلیں سجا کر یہ حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اس رحمت للعالمینؐ نے تو یہاں تک فرمایا: مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلَاۃً صَلَّتْ عَلَیْہِ الْمَلَائِکَۃُ عَشْرًا میرے لیے ایک دفعہ صلوٰۃ پڑھی (یعنی ان کی حیثیت کو تسلیم کیا ان کی تعریف کی) فرشتے دس دفعہ اس کے لیے صلوٰۃ (دعا و استغفار) کریں گے۔ ظاہرہ ہے جو بندہ ایک دفعہ نبی کریمؐ کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اُنؐ کے احکامات پر عمل کرے گا تو فرشتوں کی دعا اور استغفار کا دس دفعہ کا حقدار ٹھہرے گا اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں سمیٹے گا۔

☆☆☆

مرحوم والدین کے حقوق

اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد سب سے افضل حق والدین کا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگرتمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوکررہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرواورنرمی اوررحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہواور دعا کرتے رہو کہ پرودرگاران پررحم پرفرما جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالاتھا۔''

(بنی اسرائیل۔۲۴)

نبی کریمؐ نے متعدد موقعوں پر والدین کے حقوق بتائے ہیں اوران کو ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے جیسا کہ درجہ ذیل احادیث سے واضح ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے۔صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کیا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے۔حضورؐ نے فرمایا: ہاں، جب کہ وہ کسی شخص کے ماں باپ کو گالی دےاور جواب میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے تو گویا اس نے خود ہی اپنے ماں باپ کو گالی دی۔(مشکوٰۃ شریف،ص۴۱۹)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا جو اطاعت شعار فرزند اپنے والدین کو ایک بارنگاہ مہرورحم سے دیکھے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ایک مقبول حج لکھے گا لوگوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! خواہ ہر دن سو بار دیکھے! فرمایا: ہاں، اللہ بہت بڑا اور طیب ہے۔

(مشکوٰۃ شریف،ص۴۶۱)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور انورؐ نے ارشاد فرمایا؟: جو چاہے کہ خدائے تعالیٰ اس کی عمر میں برکت دےاوراس کا رزق برھائے،تو اس کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے اوراپنے رشتہ داروں سے تعلق قائم رکھے۔

(رواہ البیہقی کذافی الدر)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول پاکؐ نے ارشاد فرمایا: اس شخص نے اپنے والد کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جس نے اپنے والد کو تیز نظر سے دیکھا، یعنی نگاہ سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ تو گویا اس نے اپنی عمر اورا پنے رزق کو کم کیا۔ (تفسیر درمنشور، ۱۷۱/۴)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدسؐ کا ارشاد ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا ثواب ختم ہوجاتا ہے مگر تین چیزیں ایسی ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔

ایک صدقہ جاریہ، دوسرے وہ علم جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا رہے، تیرے صالح اولاد جو اس کے لئے مرنے کے بعد دعا کرتی رہے۔

(ابن ماجہ)

تیسری چیز جو اس حدیث پاک میں ذکر کی گئی ہے وہ اولاد صالح ہے، جو مرنے کے بعد دعائے خیر بھی کرتی رہے۔ اول تو اولاد کا صالح بن جانا بھی مستقل صدقہ جاریہ ہے کہ جب تک نیک اولاد کوئی بھی نیک کام کرتی رہے گی، مرحوم کو اپنے آپ اس کا ثواب ملتا ہی رہے گا۔ پھر اگر وہ نیک اولاد والدین کے لئے دعا بھی کرتی رہے (جب وہ صالح ہے تو دعائیں کرتی رہے گی) تو یہ والدین کے لئے مستقل ذخیرہ ہے۔

ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ حدیث بالا میں اولاد کو صالح کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا ہے کہ غیر صالح اولاد کا ثواب نہیں پہنچتا اور اس کی دعا کا ذکر اولاد کو دعا کی ترغیب دینے کے لئے ہے، چنانچہ یہ کہا گیا ہے کہ والدین کو صالح اولاد کے عمل کا ثواب خود پہنچتا رہتا ہے چاہے وہ دعا کرے یا نہ کرے، جیسا کہ کوئی شخص رفاہ عامہ کے لیے کوئی درخت لگا دے اور لوگ اس کا پھل کھاتے رہیں، تو ان کھانے والوں کے کھانے کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا رہے گا، یہ لوگ درخت لگانے والے کے لیے دعا کریں یا نہ کریں۔

سب سے بہتر تحفہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ قبر میں مدفون مردے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لئے چیخ وپکار کر رہا ہو، وہ بیچارہ انتظار کرتا ہے کہ اولاد، ماں، باپ یا بھائی، بہن یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے رحمت ومغفرت کا تحفہ پہنچے۔ جب

کسی کی طرف سے اس کو دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو اس کو دنیا ومافیہا سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوتا ہے۔ دنیا میں رہنے بسنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا ثواب عظیم ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جاسکتی ہے اور مردوں کے لئے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لئے دعائے مغفرت ہے۔(شعب الایمان، معارف الحدیث)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبولؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں کسی صالح مرد یا عورت کا درجہ ایک دم بلند ہو جاتا ہے تو وہ جنتی بندہ پوچھتا ہے کہ اے پروردگار! میرے درجے اور مرتبے میں یہ ترقی کس وجہ سے اور کہاں سے ہوئی؟ جواب ملتا ہے کہ تیرے واسطے تیری فلاں اولاد کے دعائے مغفرت کرنے کی وجہ سے۔

(مسند احمد، معارف الحدیث)

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: جو بندہ ہر روز (۲۵ یا ۲۷ دفعہ) اللہ تعالیٰ سے عام مومنوں ومومنات کی معافی اور مغفرت کی دعا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کی برکت سے دنیا والوں کو رزق ملتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ۔

ترجمہ: اے اللہ! تمام مومنین ومومنات اور تمام مسلمین اور مسلمات کی بخشش فرما۔

(حصن حصین، اُسوہ رسول اکرمؐ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کہ رسول کریمؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسولؐ اللہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور انہوں نے ترکہ میں کچھ مال چھوڑا ہے، صدقہ وغیرہ کی کوئی وصیت نہیں کی ہے، اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو میرا یہ صدقہ ان کے لئے گناہوں اور مغفرت ونجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ سے اسی کی امید ہے۔

(تہذیب الاثانی لابن جریر، معارف الحدیث)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بارگاہ رسالت مآبؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا اور وہ کوئی وصیت نہ کر سکیں، میرا خیال ہے کہ وہ صدقہ کی وصیت کرتیں، اب اگر میں ان کی جانب سے صدقہ

کردوں تو کیا ان کو ثواب ہوگا؟حضور کریمؐ نے فرمایا: ہاں ہوگا۔(بخاری مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہؓ کی والدہ کا انتقال ایسے وقت میں ہوا جب وہ حضور پاکؐ کے ساتھ غزوہ میں تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر حضور پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسولؐ اللہ میری عدم موجودگی میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کے لئے فائدہ مند ہوگا اور اس کا ثواب انہیں پہنچے گا۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں پہنچے گا۔ اس پر سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ میں آپؐ کو گواہ بنا تا ہوں کہ اپنا باغ میں نے اپنی مرحومہ والدہ کے لئے صدقہ کر دیا۔

(صحیح بخاری، معارف الحدیث)

والدین کا حق بعد موت

حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نے حضور پاکؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میری والدہ پر دو ماہ کے روزے واجب تھے اگر ان کی طرف سے میں یہ روزے رکھوں تو ان کو کفایت کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں، اس عورت نے پھر عرض کیا، کہ میری والدہ نے کبھی حج نہیں کیا، اگر میں ان کی طرف سے حج بدل کروں تو انہیں ثواب ملے گا؟ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا: ہاں۔(مسلم شریف)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ جو شخص اپنے مرحوم والدین کی جانب سے حج کرے تو اس حج کرنے والے کو آتش دوزخ سے نجات ملتی ہے اور اس کے والدین کو پورے پورے حج کا ثواب ملتا ہے۔ حضور پاکؐ نے مزید ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ ثواب یہ ہے کہ بیٹا اپنے مرحوم والد یا والدہ کی طرف سے حج ادا کرے۔

مرحوم والدین اپنے دوست یا رشتہ داروں کی طرف سے قربانی کرنا بھی باعث بے حد ثواب ہے۔ اس کا ثواب بھی متوفی کو اس طرح پہنچتا ہے گویا اس نے خود قربانی کی۔ حضرت علیؓ دو بکرے ہمیشہ قربانی دیا کرتے تھے۔ ایک نبی کریمؐ کی طرف سے اور دوسرا اپنی طرف سے۔ جب اس کے متعلق ان سے پوچھا گیا تو کہا: مجھے نبی کریمؐ نے حکم دیا تھا، اس لیے میں ہمیشہ یہی کرتا رہوں گا۔(ترمذی شریف)

حج کا بدل

ایک شخص نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ کیا والدین کے

مرنے کے بعدان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی کوئی صورت باقی ہے؟(یعنی کوئی صورت ہوسکتی ہے)سرکار دوعالمؐ نے فرمایا ان کے لئے دعا کرنا(جس میں نماز جنازہ بھی شامل ہے)اوران کے لیے استغفار کرنا اوران کے مرنے کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرنا(بشرطیکہ خلاف شرع نہ ہو)ان کے قرابت داروں سے صلہ رحمی کرنا جومحض ان کی قرابت کی وجہ سے کیا جائے(اس نیت سے کہ رضائے والدین حاصل اور رضائے والدین سے رضائے حق حاصل ہو)اور والدین کے دوستوں کی تعظیم کرنا۔(مشکوٰۃ،ابوداؤد،الادب المفرد)

والدین کی خدمت کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے ملنے والوں سے سلوک واحسان کیا جائے۔

(بخاری شریف،الادب المفرد)

رسول کریمؐ کا ارشاد ہے:اپنے باپ کے دوست کا خیال رکھو،اس سے قطع تعلق نہ کرو(ایسا نہ ہو کہ اس کی دوستی قطع کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہار انور بجھا دے)(الادب المفرد)

نافرمانی کا کفارہ

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:اگرکوئی بندہ خدازندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہااوروالدین میں کسی ایک اوردونوں کااس حال میں انتقال ہوگیاتواب اس کوچاہیے کہ وہ اپنے والدین کے لئے برابردعائے مغفرت کرتارہے۔ایصال ثواب کے لئے نوافل،تلاوت قرآن مجیداورصدقات کومعمول بنا لے۔اللہ تعالیٰ اس کے والدین کی مغفرت فرمائے گا اوراس بندے کواپنی رحمت سے نیک لوگوں میں لکھ دے گا۔

جوآدمی اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعدان کا قرض ادا کردیتاہے اوران کی مانی ہوئی بات پوری کرتاہے۔وہ اگرچہ زندگی میں ان کا نافرمان رہا پھربھی وہ خدا کے نزدیک ان کا فرماں بردار سمجھا جائے گا جو آدمی اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعدان کا قرض ادا کرتاہےاورنہ مانی ہوئی منت پوری کرتاہےوہ اگرچہ پوری زندگی میں ان کا فرمانبردار رہا ہو پھربھی خدا کے نزدیک ان کا نافرمان سمجھا جائے گا۔

(الادب المفرد)

والدین کےانتقال کے بعددعا کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوتا، والدین اپنی اولاد کے لئے جو دعائیں

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ انتظام کیا کہ ان کی زندگی میں قبول نہ ہونے والی دعائیں ان کے مرنے کے بعد قبول ہوتی رہتی ہیں۔ مرحوم والدین کے ساتھ زندہ رابطہ رکھنے والی اولاد کو ہر قدم پر والدین کی رہنمائی اور دعا حاصل رہتی ہے اور زندہ رابطے کی صورت یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تلاوتِ قرآن مجید، نوافل، ذکر، صدقہ جات اور نیک اعمال کے تحفے پوری باقاعدگی کے ساتھ ان کی روح کو بخشتے رہیں۔

حضرت سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سلطان دوجہاںؐ کا فرمانِ عبرت نشان ہے: جس نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے ماں باپ کا فرمانبردار ہے۔ اس کے لیے صبح ہی جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ماں باپ میں سے ایک ہی ہو تو ایک دروازہ کھلتا ہے اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ ماں باپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لیے صبح ہی کو جہنم کے دو دروازے کھل جاتے ہیں (ماں باپ میں سے) ایک ہو تو ایک دروازہ کھلتا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم کریں۔ فرمایا: اگرچہ ظلم کریں، اگرچہ ظلم کریں، اگرچہ ظلم کریں۔

(بیہقی شریف)

جس کے والدین ناراضگی میں فوت ہوئے ہوں، ایسے شخص کو چاہیے کہ کثرت کے ساتھ والدین مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرے کہ مرنے والے کے لیے سب سے بڑا تحفہ دعائے مغفرت ہے۔ ان کی طرف سے ایصال ثواب کرے۔ آپ کی طرف سے جب ان کو مسلسل نیکیوں کے تحائف پہنچیں گے تو امید ہے ان شاءاللہ وہ آپ سے راضی ہو جائیں گے۔

سرکارِ دوعالمؐ کا فرمان عالیشان ہے جو شخص اپنے والدین کے (انتقال کے) بعد ان کی قسم سچی کرے اور ان کا قرض اتارے اور کسی کے ماں باپ کو برا کہہ کر انہیں برا نہ کہلوائے وہ والدین کے ساتھ بھلائی کرنے والا لکھا جائے گا اگرچہ ان کی زندگی میں نافرمان تھا اور جو ان کی قسم پوری نہ کرے اور ان کا قرض نہ اتارے اور کسی کے والدین کو برا کہہ کر ان کو برا کہلوائے وہ نافرمان لکھا جائے گا اگرچہ ان کی زندگی میں بھلائی کرنے والا تھا۔ (طبرانی)

نبی کریمؐ کا فرمانِ رحمت نشان ہے: جو اپنے ماں باپ دونوں یا ایک کی قبر پر ہر جمعہ کے دن زیارت کو حاضر ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا اور ماں

باپ کے ساتھ بھلائی کرنے والا لکھا جائے گا۔

(ترمذی)

حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ مسلمانوں کو یہ سکھاتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو یہ کہیں:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ اِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَ لَكُمُ الْعَافِيَةَ۔

یعنی اے اس گھر والے مومنو اور مسلمانوں تم پر سلامتی ہو، ہم بھی اگر اللہ نے چاہا تو تم سے آ کر ملیں گے اور ہم اللہ سے تمہارے لیے اور اپنے لیے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

(مسلم)

☆☆☆

خاص مضمون

مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی صورتحال

شمیم شال
ترجمہ: عائشہ عثمان

متنازعہ علاقوں میں خواتین کے کردار کا تجزیہ

''مسلم معاشروں میں خواتین کا ابھرتا ہوا کردار، مواقع اور مسائل'' اس اہم موضوع پر 28، 29 نومبر 2013ء کو اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔ مقالہ نگار محترمہ شمیم شال اقوام متحدہ میں کشمیری خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں اور مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی صورتحال پر گہری نظر رکھتی ہیں۔
زیرِ نظر مضمون اس مقالے کے رواں ترجمے پر مبنی ہے۔ اخذ و ترجمہ عائشہ عثمان نے کیا ہے جو خود مقبوضہ کشمیر سے نسلی اور جذباتی وابستگی رکھتی ہیں۔ (مدیرہ)

اس حقیقت سے مزید منہ موڑنا اب ممکن نہیں رہا کہ تمام اقوام عالم کی طرح مسلم دنیا بھی اس وقت ایک انتہائی نازک دور کے چوراہے پر آن کھڑی ہوئی ہے۔ جس میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو درپیش سب سے سنگین مسئلہ قیادت کی فراہمی کا ہی ہے۔ سیاست، تعلیم، معاشیات، مواصلات، تجارت اور سائنس و ٹیکنالوجی سمیت تمام اہم محاذوں پر مسلسل قیادت کا فقدان مشاہدے میں آرہا ہے۔

ایسے حالات میں مسلمان خواتین کے کردار کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے اور ان کے اوپر یہ بھاری ذمہ داری واجب ہوگئی ہے کہ وہ ان مسائل کے ادراک اور ان کے حل کے لئے واضح سوچ بیدار کریں۔ آج کے دور کا ایک المیہ نقطۂ نظر کا واضح نہ ہونا بھی ہے۔ بعض ایسے نظریات کا پرچار کیا جارہا ہے جن کے اپنے اندر ہی تضاد موجود ہے۔ مثال کے طور پر دورِ جدید میں جو تصور سب سے زیادہ فروغ حاصل کررہا ہے وہ ''عالمگیریت'' کا تصور ہے جس کے مطابق پوری دنیا ایک عالمی گاؤں بن کر رہ گئی ہے۔ اس کو ایک عالمی نظام کے تحت چلانے کی منصوبہ بندی جاری ہے، حالانکہ اس سے مطابقت رکھنے والی کوئی یکتا عالمی تہذیب عملاً سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

اگرچہ جدید ٹیکنالوجی نے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کے طبعی فاصلوں کو مٹانے میں اہم

کردار ادا کیا ہے، بہر حال جس عالمگیر اکائی کا پرچار کیا جاتا ہے اس کی کوئی حقیقی حیثیت عملاً نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سطحی جائزہ لینے سے تو دنیا عالمگیریت یا 'Globalization' کی جانب بڑھتی دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت اندرونی طور پر یہ پہلے سے بھی زیادہ انتشار کا شکار ہوتی جارہی ہے۔

یہ 'عالمگیریت' (Globalization) دراصل ساختی انتشار کا موجب بن رہی ہے، اور موجودہ دور میں تہذیبوں کے تصادم کی شکل میں رونما ہونے والا خطرناک مسئلہ اسی مصنوعی عالمگیریت کی پیداوار ہے۔

درحقیقت مسلمان عورتوں اور مردوں کو درپیش سب سے بڑا مسئلہ موجودہ عالمگیری نظام میں اپنا نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے حصول علم کا شوق پیدا کرنا ہے۔ آج کے دور کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمان خواتین کی دنیا کے بااثر ایوانوں تک رسائی حاصل ہو سکے۔ لیکن اس اہم کام کو سرانجام دینے کی خاطر کچھ حکمتیں ملحوظ رکھنا ہوں گی۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ دنیا کے سامنے اٹھائی جانے والی آواز بہت مؤثر اور واضح ہو، دنیا کی حساسیت کے مطابق ہو، مدلل اور معتبر ہو اور اس میں کوئی ایسا خلا موجود نہ ہو جو کہ مخالف قوتوں کو تنقید کے مواقع فراہم کردے۔

میں اس ضمن میں درپیش مشکلات و مسائل کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرسکتی۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ آج کے دور میں کم ہی مسلمان ایسے ہیں جو کہ اصل حقیقت کا ادراک بھی کر پاتے ہوں۔ ہم میں سے بیشتر تو اپنے ہی تخیلات کی خود ساختہ دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ جہاں اپنی 'کمزوریوں' کو 'قوت' اور اپنی 'ناکامیوں' کو 'فتح' گردانتے ہوئے اصل حقیقت سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ وہ 'حقیقی مومن' جس کی فراست سے باطل ڈرتا ہے اور جو 'اللہ کے نور' کی روشنی میں مستقبل بینی کرتا ہے، آج کی دنیا میں ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اسلام کا تو پیغام ہی آفاقی و عالمگیری ہے لیکن ہم نے اس کو ملکوں، تہذیبوں، گروہوں اور فرقوں میں بانٹ بانٹ کر محدود کردیا ہے۔ دنیا میں حقیقی امن یعنی 'اسلام' قائم کرنے کی خاطر مخالف تہذیبوں کو ایک دوسرے کیلئے وسعت پیدا کرنا ہوگی اور چونکہ اسلام کا تو تصورِ دنیا ہی عالمگیریت پر مبنی ہے، اس لیے مسلم دنیا کو اس ضمن میں زیادہ مؤثر کردار ادا کرنا ہوگا۔

اور مشرق اور مغرب سب اللہ کے لئے

ہیں.....(سورۃ البقرہ۔آیت115)

اسلامی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو اس میں ایسے طویل روشن باب موجود ہیں جن میں مسلمانوں نے وہ تمام اصول عملاً وضع کیے جن کو آج کی دنیا میں 'Globalization' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔اسلامی تاریخ ہی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ مختلف النوع نظریاتی، جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں میں بسنے والے معاشروں کے درمیان کس طرح مشترکہ تہذیبی حس بیدار کی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ ان کی سوچ کا زاویہ ایک جیسا ہوجائے اوران کے درمیان بے مثال ہم آہنگی پیدا ہوجائے۔ عالمگیریت کے اس دور میں تہذیبوں کے مکالمے کے حوالے سے ہمیں تاریخِ اسلامی سے بہت سے موجودہ مسائل کے حل کے لئے قابلِ عمل نمونے میسر آسکتے ہیں۔

مسلمان خواتین کو آج کی دنیا میں وسیع تر مسائل کا سامنا ہے۔اور میں نے صرف ان میں سے چند مسائل کی نشاندہی کی کوشش کی ہے، جو کہ دریا کو کوزے میں سمیٹنے کی کوشش کے مترادف ہے۔اس طرح کی عالمی کانفرنسوں کا انعقاد بے حد ضروری ہے جہاں حالات کو گہرائی سے سمجھا جاسکے، مسائل کا شعور بیدار کیا جاسکے اوران کے حل کی تلاش کے لئے کوششیں کی جاسکیں۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، رِفاہ یونیورسٹی اور IMWU کی طرف سے اس عالمی خواتین کانفرنس کا انعقاد ایک انتہائی قابلِ تحسین عمل ہے اور امید ہے کہ ایسی کاوشوں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

یہاں اُن چیلنجز کی نشاندہی کی جارہی ہے جن کے اوپر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

☆دنیا کے تمام معتبر حلقوں اور بااثر ایوانوں تک مسلمانوں کی آواز کو واضح انداز میں پہنچانا۔

☆مسلمان خواتین کو ایک 'بااختیار' قوت بنانا۔

(اسلام ہی نے عورت کو وہ حقوق دیئے ہیں جن کے ذریعے سے اس کی حقیقی 'Empowerment' ہوسکتی ہے)

☆مسلمان خواتین کو تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں مردوں کے مساوی مواقع فراہم کرنا۔

☆مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کو تحفظ فراہم کرنا۔

☆مسلمانوں کو وسائل تک رسائی اوران پر اختیار کے حق کا حاصل ہونا۔

☆خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لئے باقاعدہ رسمی اورادارہ جاتی نظام قائم کرنا۔

☆متنازعہ علاقوں میں رہنے والی خواتین کا انفرادی واجتماعی تجربات کی روشنی میں تبادلہ خیال کرنے کے مواقع فراہم کرنا۔

☆غیر مسلم معاشروں میں مسلمان خواتین کے کردار کو مؤثر بنانا۔

☆تنہا پسندی کا مقابلہ کرنا۔

☆اسلام دشمنی (Islam Phobia) کا تدارک کرنا۔

دنیا کے جس خطے سے میرا تعلق ہے اس کو عام طور پر The most dangerous place on earth'' کہا جاتا ہے، یعنی کشمیر۔

اس خطے میں رہنے والی خواتین کو انتہائی سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ میرا ضمیر مجھ پر یہ پابندی اور ذمہ داری عائد کررہا ہے کہ میں آپ کو اپنے علاقے کے ان غیر معمولی سنجیدہ مسائل سے آگاہ کروں جن سے مقبوضہ جموں وکشمیر کی خواتین دوچار ہیں۔

جموں وکشمیر اور فلسطین جیسے دیگر متنازعہ جنگ زدہ علاقوں میں رہنے والی خواتین اور بچوں کے مسائل کو مختلف پہلوؤں سے سمجھے جانے کی ضرورت ہے۔

اگر ہمارے اندر سچ کا سامنا کرنے کی جرات پیدا ہوجائے تو ہمیں تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر شروع سے آخر تک ٹٹولنا ہوگا۔ پھر ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ جنگ سے وابستہ تلخیوں اور ہولناک تباہی کی داستانوں سے ہر دور کی تاریخ گونج رہی ہے۔ ایسے واقعات کی کثرت دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے کہ جیسے جنگ انسانی زندگی کا مستقل حصہ ہے۔ خواتین اور بچوں کو ہی (کمزور گردانتے ہوئے) زیادہ برے انداز میں نشانہ بنایا جاتا ہے۔

یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ جب بھی کوئی جنگ یا مسلح تنازعہ ابھرتا ہے، تمام روایتی قوانین اور اصول معلق ہوکر رہ جاتے ہیں۔ گویا کہ ''جنگ میں سب کچھ جائز ہوجاتا ہے۔''

مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ دورانِ جنگ خواتین اور بچوں ہی کو سب سے بہیمانہ انداز میں نشانہ بنایا جاتا ہے اور خاص طور پر ہر جنسی تشدد یعنیٰ Sexual harrassment' کو خواتین اور بچوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ظالمانہ طریقہ تشدد ایک جنگی حربے کے طور پر مدت سے استعمال ہوتا آرہا ہے، خواہ ہم اس سے کتنی ہی نظریں کیوں نہ چرائیں۔

Unicef کی 1996ء کی ایک رپورٹ میں یوں لکھا گیا ہے کہ ''بچوں کو جنگی جرائم کا نشانہ بننا پڑتا ہے کیونکہ ان جرائم کو روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ متعدد متنازعہ علاقوں میں کیے جانے والے تجربات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان جرائم کی روک تھام کے لیے غیر معمولی اقدامات کیے جاسکتے ہیں اور کیے جانے چاہئیں۔

مسئلہ کشمیر مسلسل ایک سنگین اور حل طلب مسئلے کے طور پر دنیا کے افق پر موجود ہے۔ یہ مسئلہ امن کا پرچار کرنے والی عالمی قوتوں کے ضمیر پر ایک سوالیہ نشان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

بھارتی زیرِ تسلط مقبوضہ کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کو مسلسل ہٹ دھرمی سے پامال کیا جارہا ہے۔ مقبوضہ جموں وکشمیر میں گزشتہ کئی دہائیوں سے انسانی حقوق معلق ہیں اور ہر قسم کی بنیادی آزادی پر پابندی عائد ہے۔ میرا دل چھلنی ہوجاتا ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ میرے خطے کے لوگوں کو آزادی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل نہیں۔ جسمانی، جنسی و ذہنی تشدد، عصمت دری، زیرِ حراست تشدد و قتل، غیر انسانی سلوک اور جعلی مقابلے تو کشمیر میں روزمرہ کا معمول ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ان سب جرائم کو قانونی تحفظ حاصل ہے اور کشمیریوں کے جان، مال اور عزت کی پامالی کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے جائز تصور کرلیا گیا ہے۔ معروف نفسیاتی معالج آشیش نندی کا Outlook میگزین میں چھپنے والا تبصرہ انتہائی دلخراش ہے، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: '' ذہنی ونفسیاتی طور پر کشمیری باشندے ہندوستان سے باہر دھکیل دیئے گئے ہیں (چونکہ ان کو وہ حقوق حاصل نہیں جو کہ ہندوستان کے دیگر باشندوں کو حاصل ہیں) اور کم سے کم بھی اگلی دو نسلوں تک یہ منفی اثرات منتقل ہوتے رہیں گے۔ قتلِ عام، rapes، تشدد جیسے دیگر انسانیت سوز مظالم نے پورے معاشرے کو متاثر کیا ہے اور کئی نسلوں کو ذہنی مریض بنادیا ہے۔''

یہ سب تلخ حقائق ہیں جن کو برداشت کرنا مشکل ہے مگر ان کو بتائے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں۔ ایک اور ماہرِ نفسیات شوبنا سونپریز نے اپنی کشمیر رپورٹ 'پرتشدد سرگرمیاں' ''Violent Activism'' پیش کی ہے جس میں انہوں نے کشمیری مردوں میں پرتشدد ذرائع سے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحانات پر تحقیق کی ہے۔ جس دردناک انداز میں شوبنا

نے مقبوضہ کشمیر کے ہولناک پسِ پردہ حقائق کو بیان کیا ہے ان کو کہنے کا بھی مجھ میں حوصلہ نہیں، لیکن ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ کشمیری عوام کے لئے مقبوضہ کشمیر بھی کسی ابوغریب جیل سے کم نہیں، جہاں بے گناہ افراد کو دہشت گرد یا Militant قرار دیا جاتا ہے اور پھر ان کے اوپر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی ایک حال ہی میں شائع کی جانے والی کشمیر رپورٹ جس کا عنوان ہے ''غیر قانونی قانون'' میں لکھا ہے کہ: ''ایمنسٹی انٹرنیشنل اصولی طور پر ہر قسم کی غیرقانونی انتظامی قید و بند کی پُرزور مخالفت کرتا ہے۔ ہندوستانی سپریم کورٹ نے بھی اس بلاجواز انتظامی قید و بند کے نظام کو ایک ''غیرقانونی قانون'' قرار دیا ہے جس نے جموں و کشمیر میں Criminal Justice System کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔

جبکہ فوجداری نظام عمل میں واضح اور متعین طریقہ کار، قانونِ شہادت کے اصول اور جرم ثابت کرنے کا باقاعدہ طریقہ وضع کیا گیا ہے تاکہ حتیٰ الامکان یہ کوشش کی جائے کہ کسی بھی بے گناہ کو سزا نہ ملنے پائے اور صرف مجرم ہی سزا کے حق دار ٹھہریں۔

یہ کسی بھی حکومت کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ ان قانونی ضابطوں کو پسِ پشت ڈال کر جنگل کا قانون رائج کردے اور بغیر کسی عدالتی یا قانونی کارروائی کے افراد کو بلاجواز پابند سلاسل رکھے یا ان پر بہیمانہ تشدد کرے۔

Indian People's Tribunal on Human Rights کی شائع کردہ رپورٹ Buried Evidence کے بالکل شروع ہی میں درج ذیل اقتباس لکھا گیا ہے:

''ہندوستان کی ریاست نے حکومت چلانے کے جو اصول جموں و کشمیر میں وضع کیے ہیں ان کا تقاضا ہی یہ بنتا ہے کہ معاشرتی تسلط قائم رکھنے کی خاطر 'تشدد' اور 'دورانِ حراست قتل' کو حربوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ کشمیر میں لاگو حکومتی نظام میں فوجی موجودگی اور کنٹرول نے کشمیری عوام کے اندر خوف و ہراس اور ذہنی دباؤ کی فضا کو جنم دیا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنائے رکھنے کے لیے جبر و تشدد اور خوف و ہراس کو ریاستی نظام کا باقاعدہ طریقہ کار بنا رکھا ہے۔ عوام میں کنٹرول قائم رکھنے کے لئے جو مختلف طریقہ کار استعمال کیے جاتے ہیں، ان میں فوجی

تعیناتی، سخت نگرانی کا نظام اور پرتشدد ظالمانہ سزاؤں کا استعمال اہم ترین ہیں۔ ماورائے عدالت قتل سکیورٹی ایجنسیوں کا معمول ہے، جسے حکومتی سرپرستی میں فروغ دیا جاتا ہے۔ نفسیاتی دباؤ کے ذریعے سے معاشرتی کنٹرول قائم رکھنے کے لیے معاشرے میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ بدامنی پھیلائی جارہی ہے۔ نتیجتاً انتہاپسندی، معاشرے سے کٹ کر الگ رہنا اور سیاسی عمل سے بیزاری کے رجحانات معاشرے میں نمایاں ہورہے ہیں۔

عام مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلح تنازعوں کے دوران غیر جنگجو خواتین اور بچوں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خاص طور پر خواتین کا صنفی بنیادوں پر جنسی تشدد، جنگوں کا لازمی جُز بن گیا ہے۔ خواتین کی عصمت دری کو جنگی حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کے ذریعے یہ جنسی وجسمانی تشدد متاثرہ خواتین ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کا مقصد ہی پورے معاشرے کی تذلیل کرنا ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے افراد ہمت شکستہ ہوجائیں اور انہیں مغلوب کرنا آسان ہوجائے۔ دورانِ جنگ Rape کو فوجیں وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی کے ساتھ جنگی ہتھیار کے طور پر نسل کشی کے لیے استعمال کرتی ہیں، جیسا کہ بوسنیا اور کروشیا میں غیر مسلم افواج کی جانب سے مسلمان خواتین کے خلاف کیا گیا (اور جیسا کہ کشمیر، فلسطین، عراق، افغانستان اور برما میں بھی دیکھنے کو مل رہا ہے)۔

(کشمیر میں خوف وہراس کی فضا اس حد تک پھیلا دی گئی اور مسلسل ذہنی دباؤ اس حد تک بڑھایا گیا کہ معاشرتی ضمیر رذیل حد تک گرا دیا گیا، یہاں تک کہ ایسے واقعات پیش آنے لگے کہ بھارتی افواج کے کارندے کسی فیملی کو پوچھ گچھ کے لیے روک کر ان کی خواتین کو تحویل میں لے لیتے ہیں اور ان کے مردوں کو کہتے ہیں کہ اگلے دن آکر ان کو لے جائیں اور مردوں کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ یا تو اپنی جان سے جائیں یا پھر اپنا ضمیر ہمیشہ کے لئے مار ڈالیں)۔

ایک عورت کی عصمت دری کو پورے خاندان بلکہ پورے معاشرے کے اوپر حملہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا ہولناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادتی کا نشانہ بننے والی اکثر خواتین کو اپنے خاندانوں بلکہ اپنے معاشرے میں ہی دھتکارا جاتا ہے، حالانکہ ان حالات پر انکا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جنگی حالات میں تشدد کا شکار ہونے والے

خواتین اور بچوں کے لیے عمومی طور پر کوئی معاشرہ بھی کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتا۔

جنگوں میں نسلِ انسانی کی تباہی اور بربادی کی اَن گنت داستانیں رقم ہوتی ہیں، جن میں لاتعداد عورتیں اور بچے خصوصی طور پر ظلم وستم کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ ہی سے ہوتا رہا ہے اور آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ بنیادی انسانی حقوق کے عالمی قوانین موجود ہیں، دورانِ جنگ ڈھائے جانے والے مظالم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوسکی۔

مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی صورتحال جنوری 1989ء تا 30 نومبر 2013ء	
کل مارے جانے والے افراد	93915
تحویل میں مارے جانے افراد	7014
گرفتار شدگان شہری	122541
عمارتوں کا انہدام	105991
بیوہ ہونے والی عورتیں	22776
گینگ ریپ کا شکار ہونے والی عورتیں	10083
یتیم ہونے والے بچے	107466

جنگوں کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ بہت سے افراد بے گھر ہوجاتے ہیں اور بہتوں کو نقل مکانی کرنی پڑتی ہے۔ خواتین اور بچوں کے لئے یہ عمل اور بھی زیادہ مشکل اور پُرخطر ہوتا ہے۔ خواتین اور بچوں کو کمزور سمجھ کر زیادہ آسانی کے ساتھ جنسی وجسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اکثر اوقات بچوں کو ان کے خاندانوں سے الگ کر دیا جاتا ہے اور یوں وہ بالکل ہی غیر محفوظ ہوجاتے ہیں۔

کشمیر کے تنازعے نے جنگ کی دنیا کے ذخیرہ الفاظ (Vocabulary) میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس جنگ میں Half Widows یعنی آدھی بیوہ کی اصطلاح ایجاد ہوئی ہے۔ (APDP) Association of Parents of Disappeared People کے مطابق پچھلی دو دہائیوں کے دوران 8000 سے زائد افراد لاپتہ ہوگئے ہیں، اور ہندوستان اور کشمیر کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ عالمی بنیادی انسانی قوانین کے مطابق Missing Persons کو ڈھونڈ کر ان کے لواحقین کے حوالے کیا جائے۔

''سکیورٹی کے ذمہ دار اداروں کی روایتی ثقافت میں محاسبے اور سزا سے استثنیٰ کے کلچر کے فروغ کا نتیجہ 8000 افراد کے لاپتہ ہونے کی صورت میں ہمیں نظر آسکتا ہے۔ اور ریاست جموں وکشمیر اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔''

(J & K Coalition of Civil Society)

میں نے آپ کے سامنے مقبوضہ کشمیر کی مجموعی صورتحال کو مختصراً بیان کیا ہے۔ ان غیر معمولی حالات میں بھی کشمیری خواتین نے جذبے اور بہادری کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا ہے۔

ایک طرف وہ ماں، بیوی، بیٹی، بہن کے طور پر اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہی ہیں اور اپنے گھر والوں کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف وہ اپنی معاشرتی ذمہ داریاں ادا کرنے میں بھی پیش پیش نظر آتی ہیں۔ وہ دھرنوں اور احتجاجی جلوسوں میں بھی بیٹھی نظر آتی ہیں۔ وہ دنیا کے Highest military concentration والے خطے میں بھی معمولی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کو قید و بند اور کسی قسم کا تشدد بھی اپنے عزائم میں ناکام نہیں ہونے دیتا۔ ان کے حوصلے اللہ کے فضل سے آج بھی بلند ہیں۔ وہ نہ صرف خود پُر امید نظر آتی ہیں بلکہ اپنی قوم کی ہمت باندھنے میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں۔

میرا سوال تو آپ سب سے ہے کہ کیا ہم بھی ان مظلوم کشمیری خواتین کی آواز میں آواز ملانے کے لئے کوئی کوشش کرتے ہیں۔

ہم آرام سے پورے کے پورے گاؤں میں خواتین کی عزتوں کے لُٹ جانے کے واقعات تو سن لیتے ہیں، لیکن عملاً ہم کیا کرتے ہیں؟ (خاموش رہ کر ہم سب بھی کہیں مجرم تو نہیں بن رہے؟؟)

ہاں، ہم اقوام متحدہ کے دروازے وقتاً فوقتاً ضرور کھٹکا کر رسمی کارروائی کر دیتے ہیں۔ ہم اقوام عالم سے تو مطالبے کرتے ہیں کہ کشمیر کے حالات کو تبدیل کریں، لیکن ہم خود اپنی سوچ تک کو تبدیل کرنے کی کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کرتے۔ یہی دراصل ہمارا اصل المیہ ہے اور میں آپ کے دوران یہ سوالیہ نشان چھوڑے جا رہی ہوں اور منتظر ہوں کہ آپ کے ضمیر کا جواب کیا ہوگا!!!

☆☆☆

خدیجہ علی

ملالہ اور نبیلہ.....

دو لڑکیوں کی ایک کہانی

ملالہ یوسفزئی ایک سولہ سالہ پاکستانی لڑکی ہے جسے 12 اکتوبر 2012ء کو وادی سوات کے شہر منگورہ میں طالبان نے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔ نبیلہ (جس کا بس یہی ایک نام ہے) پاکستان کے قبائلی علاقے شمالی وزیرستان کے ایک دور دراز گاؤں غنڈی کلا کی ایک 9 سال کی لڑکی ہے جو 24 اکتوبر 2012ء کو امریکی ڈرون حملے میں بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ خوش قسمتی سے نبیلہ کی تو جان بچ گئی لیکن اس کی 68 سالہ دادی مامنہ بی بی اس حملے میں شہید ہوگئیں۔ اس کا نحیف جسم دو ہیل فائر (HELL FIRE) میزائلوں کی زد میں آ کر ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ اس کنبے کے تین مویشی بھی جو کھیت میں چر رہے تھے ہلاک ہوگئے۔

یہ دو لڑکیاں صرف دو ہفتے کے وقفے سے زخمی ہوئیں لیکن دنیا کو ملالہ کے بارے میں تو بہت کچھ معلوم ہے لیکن نبیلہ کے بارے میں کوئی کچھ بھی نہیں جانتا۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا نبیلہ، ملالہ کے مقابلے میں کم توجہ اور ہمدردی کی مستحق ہے؟

ملالہ معجزانہ طور پر، گولی لگنے کے بعد اس حملے میں بچ گئی۔ ابتدائی طور پر اس کو علاج کے لئے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں داخل کر دیا گیا اور اس کے بعد اسے ہوائی جہاز کے ذریعے مزید علاج کیلئے برمنگھم انگلینڈ میں کوئین الزبیتھ ہسپتال لے جایا گیا۔ نبیلہ کے غریب ماں باپ کو خود ہی تگ و دو کرنے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ انکو وہی علاج میسر تھا جو شمالی وزیرستان کے بڑے شہر میران شاہ کے سرکاری ہسپتال میں ہی ممکن تھا۔ پاکستان میں ایسے دور دراز مقامات کے سرکاری ہسپتال اکثر طبی ساز و سامان اور طبی عملہ کی کمی کا شکار ہوتے ہیں۔ اور بیشتر آبادی اتنی غریب ہے کہ پشاور اور اسلام آباد کے پرائیویٹ ہسپتالوں میں علاج کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

ملالہ پر بین الاقوامی انعامات و اعزازات کی بارش ہوتی رہی یہاں تک کے اسے امن کے نوبل انعام کیلئے بھی نامزد کر دیا گیا۔ اسے 2013ء کا نوبل انعام مل تو نہ سکا لیکن یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ اس کو

اس کیلئے نامزد کیا گیا۔ ہالی وڈ کی ایکٹریس انجلینا جولی نے ملالہ کا نام اپنی ننگی کمر پر لکھوا کر اس کی نمائش کی تا کہ دنیا اس کا نام یاد رکھے۔ ملالہ کی ایک 276 صفحات کی کتاب بعنوان ''میں ملالہ ہوں'' (I am Malala) بھی شائع ہوئی جو اصل میں کرسٹینا لیمب (Christina Lamb) نے اس کیلئے لکھی ہے۔ اس کتاب میں کثرت سے خلاف اسلام مواد ہے جو مسلمانوں اور اسلام سے نفرت کرنے والی مغربی دنیا کیلئے بے حد خوش کن ہے۔ معلوم نہیں ملالہ نے یہ کتاب پڑھی بھی ہے یا نہیں اور آیا وہ اس کے اسلام دشمن مواد سے اتفاق بھی کرتی ہے؟

ملالہ کی ملاقات متعدد بین الاقوامی شخصیتوں سے کرائی گئی، ان میں امریکہ کا پاکستان اور افغانستان کیلئے خصوصی نمائندہ رچرڈ ہالبروک (جواب فوت ہو چکا ہے)، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون، ہیلری کلنٹن شامل ہیں۔ گزشتہ ماہ اس نے وہائٹ ہاؤس میں امریکی صدر باراک اباما سے بھی ملاقات کی اور ملالہ کو برطانیہ کے شاہی محل بکنگھم پیلس میں بھی بلایا گیا جہاں اس نے ملکہ الزبتھ سے ملاقات کی۔

دنیا بھر میں ایسی سولہ سالہ لڑکیاں کتنی ہیں جن کو اس طرح کے اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا ہے اور خصوصاً ایک ایسی لڑکی جو پاکستان جیسے ملک کی پسماندہ وادی سوات میں پیدا ہوئی ہو؟ اس تحریر کا مقصد ملالہ کی بچیوں کیلئے تعلیم کی تحریک کو بدنام کرنا نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مغربی دنیا کا ملالہ کو اس طرح اچھالنے کا اصل مقصد کیا ہے؟ ملالہ کے معاملے میں مغرب کا رویہ ایک صریح تضاد کا شکار ہے۔ کیا پاکستان کی ہزاروں لڑکیاں اور لڑکے جو اس سے کہیں زیادہ برے حالات سے گزرے ہیں کسی ہمدردی اور مدد کے مستحق نہیں ہیں۔ اگرچہ مثالیں تو بہت سی ہیں لیکن ہم صرف ایک پاکستانی لڑکی نبیلہ کی مثال دیتے ہیں جس کے معاملے کو مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا۔ وہ میران شاہ کے قریب غنڈی کلا گاؤں میں اپنے کچے گھر کے باہر امریکی ڈرون حملے میں بری طرح زخمی ہوئی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب ملالہ پر حملہ ہوا۔

اس کی 68 سالہ دادی مامنہ بی بی کے جسم کے اس وقت چیتھڑے اڑ گئے جب امریکی ڈرون سے اس پر دو ہیل فائر میزائل داغے گئے۔

اس بزرگ خاتون کا کیا جرم تھا؟ وہ اپنے کنبے کے شام کے کھانے کیلئے اپنے کھیت سے سبزیاں چن رہی تھی اور اس کے پوتے پوتیاں وہاں قریب ہی کھیل کود رہے تھے۔ان بچوں کی جانیں تو بچ گئیں کیوں کہ یہ دادی اماں سے کوئی 100 فٹ دور تھے،لیکن وہ زخمی ہونے سے نہ بچ سکے اور میزائل کے آہنی ٹکڑے ان کے جسموں میں گھس گئے۔ان دو دھماکوں میں نبیلہ جو اس وقت 8 سال کی تھی، اس کی سات سالہ بہن اسماء اور پانچ سالہ بہن نعیمہ زخمی ہوگئیں۔انکا تین سالہ بھائی صفدر جو اس وقت گھر کی چھت پر کھڑا تھا، دس فٹ نیچے آ گرا اور اس کے کمزور جسم کی چھاتی، پسلیوں، بازو اور ٹانگ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ اب تک ان زخموں سے صحت یاب نہیں ہوسکا۔ کیونکہ اس کے والدین اس کا مناسب علاج کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

جس روز یہ اندوہناک حادثہ ہوا نبیلہ کے کنبے کے لوگوں نے اوپر فضا میں اڑتے ہوئے امریکی ڈرون طیاروں کی گونج کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ پائلٹ کے بغیر اڑتے ان طیاروں کو دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ایسے طیارے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں خصوصاً شمالی وزیرستان میں 2004ء سے اڑ رہے تھے اور اب تک یہ ہزاروں انسانوں کو لقمہ اجل بنا چکے ہیں۔ مامنہ بی بی بھی اس نام نہاد دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کا شکار ہونے والوں میں سے ایک تھی۔

نبیلہ کے بھائی زبیر رحمان نے بتایا ''اس وقت وہاں سخت بدبو پھیل گئی اور فضا دھوئیں اور گرد سے بھر گئی۔ میں کئی منٹ تک ٹھیک سے سانس بھی نہ لے سکا۔'' نبیلہ نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایک تحقیق کار کو بیان دیتے ہوئے بتایا ''دھماکہ ہمارے بالکل قریب ہوا اور یہ اتنا شدید تھا کہ اس نے مجھے زمین سے اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور پھر زمین پر پٹخ دیا۔'' پاکستان میں امریکی ڈورن حملوں کے بارے میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ 23 اکتوبر 2013ء کو شائع ہوئی ہے۔

نبیلہ اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے ''خود زخمی ہونے کے باوجود جب میں جرأت کرتے ہوئے اس جگہ پہنچی جہاں میری دادی کچھ دیر پہلے سبزیاں چن رہی تھی تو میں نے اس کے جوتے وہاں پڑے دیکھے۔ ہمیں اس کا مسخ شدہ جسم کچھ دیر بعد نظر آیا جو کہ دھماکے کی وجہ سے کافی دور جا گرا تھا۔اس کے جسم کے ٹکڑے ہوکر بکھر گئے تھے۔ ہم نے کھیت میں سے اس کے جسم

کے جتنے ٹکڑے بھی مل سکے ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ دیا۔''

فی الواقع گھر کے سبھی افراد زخمی ہوئے۔ زبیر اور تین سالہ صفدر کے زخم زیادہ خطرناک تھے۔ کنبے کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ دونوں کا علاج کرایا جا سکے۔ انہیں علاج کیلئے زبیر اور صفدر میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انہوں نے بڑے بیٹے زبیر کا علاج کرانے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ صفدر کے مقابلے میں صحت یاب ہوکر جلد اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوسکتا تھا۔ زبیر کو کسی میڈیکل سپیشلسٹ کے علاج کی ضرورت تھی لیکن اس کیلئے بہت رقم درکار تھی۔ باپ نے اپنا زمین کا ٹکڑا فروخت کر دیا اور کئی ہسپتالوں کے چکر لگانے کے بعد بالآخر ان کو اپنے گھر سے 180 میل دور پشاور میں ایک میڈیکل سنٹر ملا جو اس تھوڑی سی رقم کے بدلے جو یہ خاندان مہیا کر سکتا تھا، زبیر کا آپریشن کر کے اس کی ٹانگ سے میزائل کا ٹکڑا نکال دے اب وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہا ہے۔

خوب صورت چہرے اور غزالی آنکھوں والی نبیلہ کو ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کے خاندان کو کیوں نشانہ بنایا گیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ امریکہ کے بہت سے اقدامات جن میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں شہری آبادی کو نشانہ بنانا ہے، جنگی جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔، وہائٹ ہاؤس کے نمائندے جے کارنے (Jey Carney) نے یہ رپورٹ شائع ہوتے ہی اسی دن (23 اکتوبر) کو اسے مسترد کر دیا اور کہا کہ امریکہ کا اقدام مکمل طور پر قانونی ہے۔

کیا امریکی جرائم اس لیے قانونی ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی خود ساختہ سپر پاور نے انہیں انجام دیا ہے؟ مامنہ بی بی کا کیا جرم تھا؟ اور نبیلہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ وہ یہ نہیں کہتی کہ مجھے وہائٹ ہاؤس یا بلیک ہاؤس آنے کی دعوت دے دی جائے۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ اسے اور اس کے بہن بھائیوں کو میزائل کا نشانہ کیوں بنایا گیا جس سے اس کی دادی کے جسم کے ٹکڑے بکھر گئے۔ اور کچھ ٹکڑے تو مل بھی نہیں سکے۔ اگر وہ مل بھی جاتے تو بھی اس کے گھر والوں کی اذیت میں کوئی کمی نہ ہوتی۔

ملالہ میں کیا خاص بات ہے کہ اسے دنیا بھر میں اتنا اچھالا جا رہا ہے جبکہ چھوٹی نبیلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اوبامہ، براؤن اور دوسری مشہور بین

الاقوامی شخصیتوں کوتو اس کے نام کا بھی علم نہیں۔ اس کے لیے تو وہ تعلیم حاصل کرنے کا ابھی امکان نہیں ہے جس کی ملالہ وکالت کرتی ہے۔

ملالہ مینگورہ سوات میں پیدا ہوئی۔ اور نبیلہ غنڈی کلا شمالی وزیرستان میں۔ مینگورہ اس قبائلی علاقے کے قریب ہی ہے۔ غنڈی کلا قبائلی پٹی کا حصہ ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملالہ کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا جبکہ نبیلہ غلطی سے حملے کی زد میں آئی۔ جہاں تک اس ننھی بچی کا تعلق ہے کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟

ملالہ دنیا بھر میں گھوم رہی ہے اور نیویارک، لندن، پیرس اور دوسرے مغربی ممالک کی راجدھانیوں میں کانفرنسوں سے خطاب کررہی ہے۔ اسے کینیڈا نے اعزازی شہریت بھی دیدی ہے جو پاکستانیوں کو اپنی سرحدوں کے قریب بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ نبیلہ اب بھی غنڈی کلا میں اپنے کچے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس کے وہ تین مویشی بھی امریکی حملے میں مارے جاچکے ہیں جو اس کے زندہ رہنے کیلئے دودھ اور پنیر کا ذریعہ تھے۔ امریکہ نے ان کے اس نقصان کو تسلیم بھی نہیں کیا۔ کجا کہ اس کا معاوضہ ان کو دیتا۔ ان کی زندگیاں دوبھر ہوگئی ہیں۔

ہم یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ملالہ کی کہانی امریکہ اور مغربی دنیا کے ایجنڈے کو دنیا کے اس خطے میں آگے بڑھانے کیلئے استعمال کی جارہی ہے چاہے اس سے طالبان یا جس نے بھی ملالہ کو نشانہ بنایا، ان کے ظلمت پسندانہ کردار پر بھی روشنی پڑتی ہو۔ لیکن ان ظالموں کی شناخت میں کوئی شک نہیں جنہوں نے نبیلہ کو نشانہ بنایا اور اسکی دادی کو شہید کیا، یعنی دنیا کی سپر پاور امریکہ۔ ملالہ ساری دنیا میں سفر کرتی ہے اور اس کے سب اخراجات کوئی اور برداشت کرتا ہے جبکہ نبیلہ شاید غنڈی کلا کے گاؤں سے باہر بھی قدم نہ رکھ سکے۔ پشاور جانا اس کیلئے ایک طویل سفر ہوگا اور زندگی کا انوکھا، خوشگوار تجربہ۔

کیا امریکہ کے جرائم مقدس ہیں اور کیا نبیلہ کی زندگی ملالہ کی نسبت کم اہمیت کی حامل ہے؟

(بشکریہ کریسنٹ انٹرنیشنل۔ ترجمہ: ڈاکٹر مقبول احمد شاہد)

☆☆☆

غزل

ہر گزر گاہ میں مل جاتے ہیں بکتے ہوئے لوگ
ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں خریدے ہوئے لوگ

اب اسی شہر نگاراں میں نظر آتے ہیں
ٹوٹے پھوٹے ہوئے روندے ہوئے مسلے ہوئے لوگ

ہر طرف خوف کا آسیب ہے پنجے گاڑے
سو دفعہ سوچتے ہیں گھر سے نکلتے ہوئے لوگ

تب سے آدابِ تعلق کو گراں جانتے ہیں
جب سے ہنگامہِ دوراں کے حوالے ہوئے لوگ

تیری خاطر میں لگے ہیں ترے قدموں میں جھکے
زندگی تیرے سراپے میں ہیں الجھے ہوئے لوگ

کب سماعت کو ملے گی کوئی جاں بخش خبر
کب ملیں گے یہ کئی سال سے بچھڑے ہوئے لوگ

ڈوبتی سانس کو تکتے ہیں بجھی آنکھوں سے
آخری شام کی دہلیز پہ بیٹھے ہوئے لوگ

چل دیئے ہیں تھکے ہارے نئی بستی کی طرف
رنج اوڑھے ، غم و اندوہ لپیٹے ہوئے لوگ

(شمیم فاطمہ)

غزل

آنسوؤں سے اُجال رکھا ہے
ہم نے گھر کا خیال رکھا ہے

دل کے دامن میں اور کچھ بھی نہیں
رنج و آہ وملال رکھا ہے

اشک پینے پلانے پڑتے ہیں
غم کا پودا جو پال رکھا ہے

اب یہ قسمت کہ کچھ ملے نہ ملے
ہم نے سکہ اچھال رکھا ہے

کیا بتائیں کہ موت کو ہم نے
کس بہانے سے ٹال رکھا ہے

زندگی بھی عجب معما ہے
ہر قدم پر سوال رکھا ہے

ہر بلندی کی آخری حد پر
ایک حرفِ زوال رکھا ہے

(کرامت بخاری)

لائحہ عمل

نام محمد طاہر زماں
والد کا نام طیب زماں
پیشہ سرکاری ملازمت
تعلیم ایم اے اکنامکس
رہائش 15/P ہاؤسنگ کالونی سنز واپڈا ہاؤس
علامتی نشان ماتھے کے دائیں جانب زخم کا نشان
مشاغل ہر لفنگے سے دوستی

محمد طاہر زماں کا بچپن جتنا اچھا اور ستھرا گذرا شاید ہی کسی اور بچے کا ہو۔ محلے اور برادری کے بچوں کی مائیں مثال دے دے کر اپنے بچوں کو سمجھایا کرتی تھیں لیکن ایسی نظر بد کا شکار رہوا کہ ساری فرمانبرداری اڑن چھو ہوگئی۔ جوانی تو سب پہ ہی آتی ہے اس پر بھی آئی لیکن ایسا چولا بدلا کہ رنگ ڈھنگ بھی ساتھ ہی بدل گئے۔ کہاں کی فرمانبرداری اور کہاں کی بردباری اب تو کبھی ماشکیوں کے شہزاد کے ساتھ ہے تو کبھی شیخوں کے اسجد کے ساتھ..... ہاں ماں بہنوں کی دعاؤں کے نتیجہ میں اتنا فرق ضرور پڑا کہ یار بیلی جتنے لفنگے اور برے تھے طاہر خود اتنا برا نہیں تھا۔ لیکن ماں کو یہی غم کھائے جاتا کہ بری صحبت بھی تو ہزار برائیوں کی جڑ ہے۔ کبھی کبھار تو وہ اونچی آواز سے رونے لگ جاتیں۔

ہائے کس کی نظر لگ گئی میرے طاہر کو؟ ایسا شریف باپ باوقار گھرانہ ننھیال دودھیال میں کوئی ایسا نہیں یہ کس پر پڑ گیا؟ یہی نہیں اتنی اچھی سرکاری ملازمت کو اس نے اعزاز کی بجائے یار بیلیوں کے شغل میلے کا باعث بنالیا!'' اٹھتے بیٹھتے پند و نصائح ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہتا وہ ہنس کر بس یہی کہتا۔

''امی آپ کا بیٹا ہوں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کبھی اپنے دوستوں والی گندگی میں نہیں اتروں گا۔''

امی کھٹ سے کہتیں ''ایسی دوستی سے بڑھ کر کس گندگی کا منہ دیکھو گے؟؟ دنیا جہاں کے لفنٹروں سے جڑ کر بیٹھے رہتے ہو'' افوہ تھوڑا سا شغل ہی تو ہے آپ اتنا پریشان مت ہوا کریں،،۔ وہ انہیں مطمئن کرتا۔

''شغل؟ وہ چیخ کر کہتیں۔ لڑکیوں کے نمبر لے کر انہیں فون کرنا طرح طرح کے نام رکھنا۔ ان کو بدنام کرنے کی کسر اٹھا نہ رکھنا، شغل ہے تمہارے نزدیک؟؟

طاہر سناٹے میں آ گیا۔ یہ کہنے کے قابل بھی نہ رہا

کہ آپ کو کیسے پتہ چلا، سر جھکا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

طاہر کی ملازمت چونکہ نادرا میں تھی اس لیے حسینوں ماہ جبینوں کے درشن کے مواقع دن میں کئی کئی دفعہ میسر ہوتے۔ چونکہ وہ خود فطرتاً برا نہیں تھا اس لیے نظروں کی پیاس بجھا لیتا یا زیادہ ہوا تو نیو ڈیٹا فارم میں سے کسی بھی نازک اندام چنبیلی حسینہ کا نمبر اپنے فون میں ضرور محفوظ کر لیتا۔ کبھی مہینوں کے بعد منہ کا ذائقہ بدلنے کو ایک آدھ کا نمبر بھی ملا لیتا۔ ان کو کیا علم نمبر کس کا ہے!!

ہاں امجد، شہزاد، فاروق، منصور، عرفان دنیا جہاں کے لعنتی کردار تھے۔ مینہ آئے یا آندھی وہ روزانہ اس کے آفس میں کم از کم ایک دفعہ تو ضرور ڈیرہ ڈالتے۔ شناختی کارڈ بنوانے کے لیے جتنی عورتیں یا لڑکیاں موجود ہوتیں سب پر تبصرے ہوتے۔ فقرے کسے جاتے، آنے بہانے ان سے گفتگو کے مواقع پیدا کئے جاتے۔ یہ صرف ماہ رُخوں کے ساتھ نہیں ہوتا تھا موٹی بھدی لڑکیاں یا خواتین بھی نہ بخشی جاتیں۔

''یار مقصود سنا ہے کل سے تمہاری بھینس گم گئی ہے۔''

امجد معصومیت سے کہتا ہے۔

''یار گم تو ہوئی تھی پیر صاحب نے تعویذ دیا تھا نادرا کے آفس کے آس پاس ملے گی۔'' مقصود اس سے بھی زیادہ معصومیت سے جواب دیتا ہ.....

اگر تو آفس میں موجود ''بھینس'' کی حس سماعت اور حس مزاح تیز ہوتی پھر تو دونوں کان لپیٹ لیتے۔ کچھ واقعی انارکلی کی 'بھولی مجیں' ہی ثابت ہوتیں۔

''ہا ہا..... گل گنوائی'' (فقرہ ہی ضائع ہوا) مقصود سرد آہ بھرتا..... کبھی آنے والی کا'' اک بات کہوں دلدارا تیرے عشق نے ہم کو مارا '' سے استقبال ہوتا۔ جہاں کہیں خوبصورت پری رو چہرہ آتا۔ سارے الرٹ ہو کے بیٹھ جاتے۔ انتہائی شریف اور مدبر بن کر۔ نظروں ہی نظروں میں اشارے ہوتے، جی بھر کے سراپا حسن کو دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں سراہا جاتا، پھر گفتگو کا بہانہ ڈھونڈا جاتا۔ کوئی فقرہ بھی چلبلا سا کس دیا جاتا۔ اب یہ تو قسمت کی بات ہے کوئی دھپ دھپ کرتے چلی جاتی۔ کسی کی نظروں ''میں کچا چبا جاؤں گی۔'' والا جلال ہوتا کوئی حقارت سے ٹھڈا لگا کر چلی جاتی۔ ایک آدھ بار تو ہیل والا جوتا بھی اترتا دیکھا ہاں کمی ان کی بھی نہیں تھی جو نظروں کے ایک اشارے پر لٹو ہو جاتیں۔

دعوت قبول ہی نہیں کرتی تھیں فون نمبروں کے تبادلے تک منٹوں میں کرلیتیں۔ بعد ازاں، کون کون کس کو فون کرتا اور کھٹے میٹھے تلخ وشیریں تبصرے سننے کو ملتے یا گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوتے۔ یہ اگلے دن کی ملاقات پر زور وشور سے بتایا جاتا۔

طاہر اپنے دوستوں کی طرح چھچھورا تو نہیں تھا پر ادب کا دلدادہ اور حسن پرست تھا۔ اگر کوئی خوبرو چہرہ اسے بھا جاتا وہ بڑے دلچسپ ناموں کے ساتھ فون میں سیو (Save) کرتا۔ کوئی حسینہ ''نازنین'' کے نام سے اس کے فون میں جگہ پاتی تو کسی کو ''ماہ پارہ'' لکھا جاتا کوئی ''دل پذیر'' ہوتی تو ''کوئی دل ربا''

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ یار بیلیوں کو تھوڑا سا بھی شبہ ہو جاتا تو خوب ریکارڈ لگاتے۔ دوستی کے معاہدے کی پہلی شق کی خلاف ورزی قرار دیتے۔ مگر طاہر بھی کایاں تھا۔ اپنے دل کے معاملات دل تک ہی رکھتا۔ یاروں سے شغل میلہ ضرور تھا، 'دلداری' نہیں، اس لیے ان کے ساتھ ان کی سرگرمیوں میں شامل ہوتا۔ آگے نہ بڑھتا۔ انہی دن اور راتوں کے الٹ پھیر میں ''ملیحہ'' نام کی لڑکی شناختی کارڈ بنوانے کے لیے آئی۔ نام ہی ایسا کہ عش عش کرنے کو دل چاہے۔ صورت کے علاوہ نازو انداز ایسے کہ کسی ملک کی مہارانی.....! سوالوں کے جواب دیتے ہوئے آواز بھی سنائی دی۔ اس کی آواز سن کر سب دل پھینکوں سمیت طاہر نے بھی دل پکڑ لیا.....!! آواز کیا تھی، ؎ 'ہم سا ہو تو سامنے آئے' کا غرہ لئے ہوئے۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک طاہر اسی کے خیالوں میں کھویا رہا۔

مقصود ہنسا..... ''بڑی پٹاخہ تھی۔ ابھی تک ناک اور کانوں سے دھواں نکل رہا ہے۔''

اسجد نے آنکھ ماری۔ ''یار ایک ہی مصرعہ ذہن میں آرہا ہے اس قیامت کو دیکھنے کے بعد۔ ؎ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔''

شہزاد شیخ نے لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ ''بیوی ہو تو ایسی ہو، یار جگر کیا میں نے غلط کہا ہے؟ ذرا فارم تو ادھر کرو.....ہم بھی دیکھیں کہاں رہتی ہے اور فون نمبر کیا ہے''۔

طاہر کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی دیکھ کر سب نے سیٹیاں بجائیں۔ ''او.....ئے..... یہ کیا؟؟

طاہر نے فارم لا کر میں ڈالا اور ایک دم اٹھ کھڑا

ہوا۔ آج ضروری کام ہے جلدی گھر جانا ہے۔ پیین (Peon) کو کمرہ لاک کرنے کا کہا اور گاڑی لینے پارکنگ کی طرف چل دیا۔

جاتے ہوئے ایک ہی سوچ حاوی تھی کہ ''لائحہ عمل'' بدلنا پڑے گا.....!!

ایک ہفتے کے بعد طاہر آفس میں آیا۔ پورا ہفتہ وہ کہاں رہا، یار بیلیوں میں سے کوئی نہ جان سکا۔ پورا ہفتہ اس نے اپنا سیل فون آف کیے رکھا.....!!

مقصود، شہزاد، اسجد بار بار ملنے آئے وہ ملازم سے ''صاحب جی گھر پر نہیں ہیں'' کہلواتا رہا۔

آٹھویں دن وہ آفس گیا تو اس کے دل کی دنیا بدلی ہوئی تھی۔ ظاہر میں صرف چھوٹی چھوٹی خشخشی داڑی یا شیو بڑھی محسوس ہوتی تھی مگر اس کا اندر بہت بدل چکا تھا۔!!

جونہی آفس میں داخل ہوا چند ہی لمحوں کے بعد مقصود نے اس کی پیچھے سے گردن دبوچی۔

''کہاں دفع ہو گئے تھے؟''

طاہر نے جواب دیئے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

''دو تین منٹ میں شہزاد اور اسجد بھی پہنچ گئے۔''

''فاؤل .....فاؤل.....بغیر بتائے اتنی لمبی چھٹی؟؟ اب تم جرمانہ ادا کرو ہفتہ پہلے والی حسینہ ملیحہ کا نمبر بھی شیئر نہ کیا.....

''ادب اور تمیز سے بات کرو، ملیحہ اب میری منکوحہ ہے۔ میں ایسا کوئی لفظ برداشت نہیں کروں گا''۔

ا.....و.....'' سب کو سانپ سونگھ گیا۔ معاملہ کہیں نہ کہیں گڑ بڑ تھا۔ ہفتہ بھر غائب رہنا۔ اتنی بے نیازی اور کھردرا پن..... پھر دوستوں کو شامل کئے بغیر نکاح؟؟؟ یہ کیا ہوا؟؟

شہزاد نے ہی ہمت کر کے مبارک باد دی۔

''اچھے یار بیلی ہو، چپ چپاتے شادی کر لی.....''

''اس وقت تو مجھے بہت کام ہے ہفتہ کا جمع شدہ کام بھی کرنا ہے اور ان سب کو بھی بھگتنا ہے۔'' اس نے خواتین کی لمبی لائن کی طرف اشارہ کیا اور کاغذات الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیئے۔

چند لمحے .....اگلے چند لمحے سب پر بڑے بھاری گزرے۔ پھر ایک ایک کر کے سب کمرے سے نکل گئے۔

؎ بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔

مقصود نے کہا چاروں کے نکلنے کے بعد طاہر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر لمبا سانس لیا اور چند لمحوں میں ملیحہ کو

کال کی۔

''جی..... پہلا مرحلہ بخیر و عافیت گزر گیا ہے۔''

''شکر ہے.....آئندہ بھی بھلا ہوگا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

ہفتہ پہلے اس دن گھر پہنچنے پر اس نے ملیحہ کی فوٹو اور گھر کا پتہ آپی اور امی کے سامنے رکھا۔

''یہ کیسی ہیں؟ آج ہی پتہ کر کے بتا دیں۔'' دونوں لمحہ بھر میں بات کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ ملیحہ عمارہ آپی کی ہونہار لیکن غریب سٹوڈنٹ تھی۔ باپ کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوا تھا۔ چچا گھر ہتھیانے کے چکروں میں تھے۔ پہلی ملاقات میں عمارہ آپی ان لوگوں سے اور وہ ان سے مطمئن تھے دل کی مراد پوری ہوگئی۔ نکاح کے بعد دونوں کو اکٹھے بٹھایا گیا۔ ملیحہ کے سیل پر بار بار بیل ہو رہی تھی جسے وہ آف کر دیتی ہے۔ ہاتھ آگے بڑھا کے طاہر نے موبائل پکڑا۔ اسے چار سو بیس والٹ کا جھٹکا لگا۔ نام کی جگہ پر ''لعنتی کردار'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے نمبر دیکھا۔

''اوہ.....'' یہ مقصود کا نمبر تھا۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے شہزاد اور اسجد کے نمبر پریس کیے آگے تو شہزاد کے نام کی بجائے ''کُتا'' اسجد کے نام کے آگے ''ذلیل'' لکھا ہوا تھا۔ طاہر کو یاد آیا دو چار دفعہ تو اس نے بھی رانگ کال کی تھی اس نے جلدی سے اپنا نمبر ملایا۔

.....دھک دھک کرتے دل کے ساتھ

اس نے سکرین پر نظر ڈالی.....لکھا ہوا تھا۔

''گدھا''

طاہر نے جلدی جلدی سب نمبر ڈیلیٹ کر کے اپنی سہیلیوں سے خوش گپیوں میں مگن ملیحہ کو سیل فون تھمایا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ اپنی یہ والی سم آف کروا کے نئی خریدی۔

تیسرا اور سب سے ضروری کام ملیحہ کو اعتماد میں لے کر کرنے والا تھا وہ تھا ان دوستوں کی دوستی سے چھٹکارا کیسے ملے .....!! اس لئے کہ ذلالت اور لعنت تو کمبل کی طرح چمٹ جاتی ہے لیکن گدھے سے انسان بنا جا سکتا ہے.....

؎ اگرچہ اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!!

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی.....

ثمینہ نے مہمانوں کی فہرست مکمل کر کے اس پر دوبارہ ایک نظر ڈالی کہ کوئی رہ تو نہیں گیا۔ عید قربان میں تین دن رہ گئے تھے۔ وہ ہر سال عید کرنے گاؤں چلے جاتے۔ لیکن اس دفعہ ان کے شوہر کرنل واصف کی ڈیوٹی لگ گئی تھی۔

سارے ملازموں کو علم تھا کہ عید پر چھٹی ضرور ملے گی۔ ساتھ عیدی اور جوڑے بھی ملیں گے۔ تو وہ اپنے گھروں میں جا کر اپنے خاندان کے ساتھ عید منائیں گے جب کرنل صاحب نے بتایا کہ کسی کو چھٹی نہیں ملے گی تو سب کے منہ لٹک گئے کہ وہ سب آن ڈیوٹی ہیں۔

سب سے زیادہ افسوس شیر خان کو ہوا جو ہنزہ سے آیا ہوا تھا اور ایک سال بعد چھٹی جا رہا تھا۔ اس کو عید الفطر پر چھٹی نہیں ملی تھی۔ اس کے خیال میں یہ سراسر زیادتی تھی۔ وہ فوج کا ملازم نہیں تھا۔ اس نے کرنل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے کمرے میں جا کر بولا ''صیب جی بات کرنا ہے''۔

''بولو کیا بات ہے''۔ کرنل صاحب نے ٹی۔وی پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

''صیب جی ہمکو عید کی چھٹی جانا ہے۔ ایک سال ہو گیا ہے چھٹی نہیں ماتگا کہ عید پر جاؤں گا''۔

''لیکن عید کی چھٹی بند ہے حکومت کی طرف سے''.....انہوں نے جواب دیا۔

''صیب جی آپ فوج میں ہے آپ کا چھٹی بند ہے میرا تو نہیں ہے۔ میں نے جانا ہے چھٹی دے دو''۔

''نہ دوں تو.....؟ انہوں نے غصے سے گردن موڑ کر کہا۔

''تو پھر پکی چھٹی کر دو میں واپس نہیں آؤں گا۔ میرا حساب کر دیں''۔

کرنل صاحب چپ ہو گئے۔ وہ بڑا نیک نمازی، ایماندار اور وفادار ملازم تھا۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ اور بھروسے والے کام اسی کے سپرد کرتے وہ اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ نرم پڑ گئے۔

''اچھا..... (لہجہ تھکا ہوا تھا) کتنی چھٹی چاہیے''۔

''ایک مہینہ واسطے سفر لمبا ہے۔ میری ماں بہت بیمار ہے۔ میں اس کی خدمت کرونگا''۔

''یہ تو بہت زیادہ ہے''۔ انہوں نے سوچ کر جواب دیا۔

''پھر مجھے فارغ کردیں''۔ اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

دل ہی دل میں بولے..... سالا بلیک میل کرتا ہے ان کی تعریف کرو وتو سر پر چڑھ جاتے ہیں۔

''اچھا کل چلے جانا۔ آج سارے کام ختم کرلو''۔

''کام میں نے کر دیئے ہیں، آج ہی جانا ہے، بیگم صیب سے یہ کہہ دیں میرا حساب کردیں''۔

''اچھا ٹھیک ہے چلے جانا''۔

انہوں نے سوچا۔ تین ملازم باقی ہیں۔ تین قربانیاں سارے یونٹ کا کھانا گوشت تقسیم کرنا۔ مٹھائی لے کر آنا۔ گزارا ہو جائیگا کوئی بات نہیں وہ حساب کتاب کر کے اٹھے کہ اپنی بیگم ثمینہ کو بتائیں۔

دوسرے کمرے میں روبینہ ان سے چھٹی مانگ رہی تھی۔

''بیگم صاحبہ عید کے موقع پر سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے۔ اتنا کھانا پکانا۔ بچے آتے ہیں صرف تین دن کی چھٹی دیدیں۔ ایمان سے چوتھے دن واپس آجاؤنگی''۔

''تم جب جاتی ہو پندرہ دن سے پہلے کبھی نہیں آئی''۔

''سچی بات ہے بیگم صاحب جا کر ایسا سکھ ملتا ہے کہ واپس آنے کو دل نہیں کرتا۔ اگر مجبوری نہ ہو تو نوکری چھوڑ دوں''۔

''عید کے دوسرے دن میرے بھانجے کی شادی ہے۔ اس کیلئے اور پانچ ہزار ایڈوانس دے دیں۔ اب میں کہاں کپڑے سلواؤنگی تین دنوں میں کونسا درزی سی کردے گا''۔

''اچھا چلو سارے کام ختم کرو۔ میں جا کر اے ٹی ایم سے پیسے لے آؤں۔ تم کھانا بنالو۔ جوڑا میں نے بہت اچھا رکھا ہوا ہے۔ تم خوش ہو جاؤ گی۔ لیکن دیکھو وعدے پر آجانا''۔ جب وہ باہر جانے کیلئے نکلی تو دونوں میاں بیوی کی نظریں چار ہوئیں تو کرنل صاحب بولے۔

''شیر خان ایک ماہ کی چھٹی جارہا ہے''۔

''اور آپ نے دے دی.....'' وہ پریشان ہو کر بولیں۔

''اس نے ریزائن کی دھمکی دی میں کیا کرتا''۔وہ نرمی سے بولے۔

''روبینہ بھی جارہی ہے میں اس کے لئے اے ٹی ایم سے پیسے نکلوانے جارہی ہوں اسے کیوں جانے دیا''اب پریشان ہونیکی ان کی باری تھی۔

''اس کے بھانجے کی شادی ہے''وہ بولی۔

''یہ دونوں تو اس گھر کے ستون ہیں گھر تو لاوارث رہ جائیگا۔ بھلا خلیل اور قائم دین کیا سنبھالیں گے.....''

''میجر طارق کوفون کریں۔ایسے کاموں میں وہ طاق ہے۔کہ دو ملازم میاں بیوی ہوں تو دس پندرہ دن کیلئے بھجوادے،ہم انہیں دس ہزار تنخواہ کھانا پینا اور عیدی بھی دینگے''۔بیگم نے مشورہ دیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ابھی فون کرتا ہوں''۔

اتنے میں خلیل آیا کہ میرے والد صاحب سیڑھیوں سے گر گئے ہیں انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے۔ اس نے چھٹی مانگنے کی زحمت گوارانہ کی بس اطلاع دی پیسے بھی نہ مانگے کیونکہ چار دن پہلے اس کو تنخواہ مل چکی تھی۔کرنل صاحب نے میجر طارق کوفون کیا۔

''ہیلو طارق کیسے ہو''۔

''السلام علیکم سر! کیسے یاد کیا''۔

''پندرہ دن بلکہ مہینے کیلئے دو ملازم میاں بیوی ہوں تو ٹھیک ہیں۔انتظام کردو شام تک بھجوادینا''۔

''او کے سر نو وری ہو جائیگا''۔

''شکر ہے یہ کام تو ہو گیا۔میجر وعدے کا پکا ہے، کرے گا''۔

شام کو میجر ایک میاں بیوی کو لے آیا۔

''یہ تو بالکل پینڈو لگ رہے ہیں۔کام سنبھال لیں گے''۔

''سر عارضی ..... چند دنوں کی بات ہے۔پھر اپنے پرانے ملازم واپس آجائینگے''۔

مسز کرنل نے اُن کو دیکھا عورت کا قد لمبا تھا پیلی دھوتی،سرخ قمیض اور کالی چادر۔

''کدھر سے آئی ہو؟''انہوں نے پوچھا۔

''چندرے سے''۔

''یہ کدھر ہے''۔

''یہ ہمارے گاؤں کا نام ہے''۔

ثمینہ نے نظروں سے تولتے ہوئے پوچھا،''کام کرلوگی''۔

''بالکل آپی جی نو پرابلم کم کی اے دسونا''(کیا

کام ہے بتائیں نا)

''اچھا یہ اپنا حلیہ تو بدلو''۔

''کیوں جی کپڑے نال کی پرابلم اے''۔ عذرا بولی۔

''مہمان آئینگے تو کیا کہیں گے یہ پینڈو کہاں سے آئے ہیں''۔

''جی پینڈو پنڈ سے آئے ہیں''۔ وہ چہک کر بولی۔

''تیری زبان بہت چلتی ہے۔ چلو میں کپڑے دیتی ہوں شلوار قمیض پہنو۔''

پر تم تو بہت لمبی ہو میری شلوار چھوٹی ہوگی''۔

''نو پرابلم آپی جی ..... پہلے میں پانی پی لوں بڑی دور سے آئے ہیں''

میجر طارق کی بیگم عظمیٰ نے کہا۔''ہمارا نوکر بھی چھٹی پر گیا ہے تم نے دونوں ملازم اپنے باس کو بھجوا دیئے۔ہم کیا کرینگے''۔

''اب باس کا حکم میں کیسے ٹال سکتا ہوں۔ جانم فکر نہ کرو میں خود کام کرونگا۔'' ایک کھانا باس کے ذمے یونٹ میں دوپہر کو کسی کے گھر سے قربانی کا گوشت آ گیا تو ٹھیک ورنہ کل کا سالن تو رکھا ہے تم پلاؤ بنالینا۔عید کی خاص ڈش.....''

''وہ بھی تمہارے ہاتھ کی ..... واہ مزہ آجائیگا۔''

''اب مسکہ نہ لگائیں کام تو مجھے کرنا پڑے گا۔ آپ تو صرف ڈرامے کرتے رہینگے''۔

عید کے دن صبح صبح کرنل صاحب نے چائے مانگی جو شیر خان لاتا تھا۔عذرا سرونٹ کوارٹر میں سو رہی تھی۔نا چار بیگم اٹھی چائے بنا کر پیش کی۔

انہوں نے عید کے کپڑے پہنے اور نماز کیلئے نکلے۔جاتے ہوئے کہہ گئے بیگم سو نہ جانا آج عید کا دن ہے تم بھی پندرہ ہزار کا سوٹ پہن کر عید کا سجدہ دے لو۔

''توبہ ہے ایک سوٹ کیا لے دیا۔دس بار احسان گنوایا ہے''۔

''اتنا مہنگا ہے ریکارڈ ہے ذکر تو آئے گا''۔ وہ ہنستے ہوئے بولے''

زندگی میں ایک سوٹ کیا لے دیا۔میری سات پشتوں پر احسان کر دیا۔کمانڈر کی بیوی ہر فنکشن میں ایسا سوٹ پہن کر آتی ہے'' وہ بولتی رہی لیکن کرنل صاحب نے ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گئے ڈرائیور نہیں تھا گاڑی خود ہی چلانی پڑی۔

بیگم نے دو تین دفعہ بیل بجائی۔ جو سرونٹ کواٹر میں بجتی تھی لیکن عذرا نہ آئی۔ انہوں نے جلدی جلدی انڈوں کا آملیٹ بنایا بازاری پراٹھے گرم کیے چائے دم کی۔ تینوں بچے لاہور میں زیر تعلیم تھے۔

ابھی وہ چلے تھے بس سیالکوٹ پہنچنے والے تھے۔

بیگم نہا کر تیار ہو گئیں۔ عذرا آئی اور کہنے لگی۔

''آپی جی دسو کی کرنا اے''۔

''میرا سر..... میں سب کچھ کر چکی ہوں تم اب اٹھ کر آئی ہو''۔

''کیوں جی کی کرنا سی، ناشتہ میں بنا دیتی ہوں''۔

''میں بنا چکی ہوں تم جلدی جلدی صفائی کر لو''

مگر تمہیں تو ویکیوم کرنا نہیں آتا۔ چلو جھاڑو دے لو''۔

''اوہ کی ہندا دسو میں سکھ لیواں گی'' (وہ کیا ہوتا ہے بتائیں سیکھ لونگی)

''جا باہر سے جھاڑو لے آ، یہ دروازہ نہ کھولنا۔ سامنے سے جاؤ''۔

اس نے جھاڑو لیا اور ساتھ ہی گنگنانا شروع کر دیا۔ لگا دے مدینے کی گلیوں میں جھاڑو اتنے میں گیٹ پر بیل بجی ''جاؤ عذرا دیکھو باہر کون آیا ہے''۔

''اچھا آپی جی.....'' ''یہ مٹھائی آئی ہے کہاں رکھوں''۔ ''میز پر رکھ دو''۔

اتنے میں عذرا کا موبائیل بج اٹھا۔ ہائے ہائے کون ہے عید مبارک آپ کو بھی کپڑے پائے نے .....کی پکاؤ گے آج .....؟ میں کی پکانا جو صاحب لوگ دینگے کھالونگی۔

اک پردیسی دوجے مزدوری
سانوں کون کھوائے چُوری

''چُوری کی بچی فون بند کرو یہ صفائی تو ختم کرو''

''اللہ جی کرنی آں غصّہ نہ کھاؤ''

اتنے میں بچے آ گئے۔ کرنل صاحب انہیں ساتھ لے آئے۔

''ہائے میں صدقے میرے بچے آ گئے۔ عذرا کہاں مر گئی ہو۔ کوک لے کر آؤ''۔

''جی میں فون سن رہی ہوں''۔

''لاؤ ادھر مجھے دو۔ اسے بند کرو۔ فون سنتی رہو گی تو کام کون کرے گا''۔

''آپی جی آج اساں غریباں دی وی عید ہے۔ عید مبارک کے فون آ رہے ہیں''۔

''بڑی سوشل ہو''۔

''او کیہہ ہندا جی؟''

''کتنی پڑھی لکھی ہو؟''

''ککھ بھی نہیں۔ کسے پڑھایا ہی نہیں''

میجر طارق کی بیگم نے فون اٹھایا۔ یہ اس کی پرانی ملازمہ نازیہ جو سات سال اس کے پاس رہی تھی اس کا فون تھا۔ بڑی اچھی ملازمہ تھی اب شادی ہوگئی تھی۔

''تم رو کیوں رہی ہو خیریت ہے؟''

''کیا بتاؤں بیگم صاحبہ میری بیٹی آٹھ دن کی ہو کر فوت ہوگئی ہے''۔

''اوہو.....صبر کرو۔ اللہ کی چیز تھی اس نے لے لی۔ انشاءاللہ پھر اولاد ہوگی فکر نہ کرو''۔

''نہ باجی میں بچی کو تھوڑی رو رہی ہوں یہ تو بچی کے باپ کا قصہ ہے''۔

''اس نے کیا کیا.....؟''

''وہ اسلام آباد ہوتا ہے۔ دس دن سے چھٹی آیا ہوا تھا۔ اس کو کسی لڑکی کے فون آتے ہیں۔ میں دور بیٹھی پہچان لیتی ہوں جی اس کی ٹون ہی بدل جاتی ہے۔ دن میں چار چار میسج ..... وہ روتے ہوئے بولی حرام ہے جو اسے میری رتی برابر پروا ہو یا بچی کا افسوس کیا ہو۔ اور ہی نشے میں پھرتا رہا''۔

''تم اس کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤ''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''نہ جی تنخواہ تھوڑی ہے چھ ہزار پہ ایک کمرہ ملتا ہے۔ یہاں ساس سسر اور دیور رہتے ہیں ان کی خدمت کرتی ہوں۔ وہ شہزادہ وہاں عیش کرتا ہے''۔

''ساس سسر کو پتہ ہے'' اس نے سوال کیا۔

''جی انہیں سب پتہ ہے۔ میں نے اس کا موبائل لے کر میسج دیکھے تین لڑکیاں ہیں چندا ،راحیلہ اور آسیہ..... میں نے کہا یہ کیا ہے؟ شرم نہیں آتی میرا دکھ بٹانے آئے ہو یا مجھے دکھ دینے آئے ہو؟ کہنے لگا میرے ساتھ کام کرتی ہیں کوئی مشورہ لینا ہوتا ہے تو بات کر لیتیں ہیں تم تو خواہ مخواہ شک کر رہی ہو۔ میں نے کہا شکورے جھوٹ بولنے والے پر خدا کی لعنت۔ چھٹیوں میں کونسا دفتر کھلتا ہے میں نے اس کا موبائل توڑ دیا وہ روٹھ کر چلا گیا۔ میرے سسر کہنے لگے مردوں کو کون ڈوری ڈال سکتا ہے۔ فکر نہ کر آپ ہی آجائیگا۔ اب میں فون کرتی ہوں تو وہ اٹھاتا نہیں۔ سخت بے قرار ہوں، سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔ اس لڑکی کو فون کروں تو میرے شوہر کو بُرا لگے گا۔ مجھے چھوڑ ہی نہ دے۔ ساس کہتی ہے دو چار دنوں میں خود ہی مان

جائیگا۔سب کو چھوڑ کر کہاں جائیگا۔''

''باجی جی ظلم.....ایک نہیں تین تین لڑکیاں ہائے میں کیا کروں! یہ موبائیل تو میری خوشیوں کا قاتل نکلا۔''

اس کا فون بند کر کے عظمیٰ گہری سوچ میں گم تھی۔

اتنے میں میجر صاحب کا فون بج اٹھا۔ بیگم نے اٹھایا کسی اجنبی لڑکی کی آواز تھی۔ ''کیسے ہو طارق.....تمہیں تو خیال نہیں آیا سوچا میں ہی عید مبارک کہہ دوں''۔

''ہیلو.....آپ کون ہیں''عظمیٰ حیرت سے بولی۔

''اوہ ساری رانگ نمبر۔'' اس نے فون فوراً بند کر دیا۔

اب میجر کی شامت آ گئی۔''کون تھی یہ اتنی لگاوٹ سے عید مبارک کہنے والی، جلدی بتاؤ آپ نے مجھے دھوکہ دیا ہے''۔

''ہوش کے ناخن لو، کئی لڑکیوں کے فون آ جاتے ہیں سب کے پاس موبائل ہیں میں تو نہیں کرتا''۔ طارق نے صفائی پیش کی۔

''آپ سنتے تو ہیں..... ایک دفعہ رکھ کے بے عزتی کریں تو دوبارہ نہیں کرے گی''۔

''تم خواہ مخواہ شک کر رہی ہو''۔

''پہلے آپ بتائیں یہ لڑکی کون تھی ابھی اسی نمبر پر اسے میرے سامنے فون کریں اور کھری کھری سنائیں۔ اگر آپ سچے ہیں۔ابھی کریں.....میں نے کہا نا ابھی کریں ورنہ جائیں پھر اسی کے ساتھ جا کر رہیں''۔

''تم پاگل ہوئی ہو لو میں کان پکڑتا ہوں۔ اب نہیں سنوں گا''۔

''تو پھر دال میں کچھ کالا ہے نا''۔

''کالا، پیلا، نیلا سبھی کچھ ہے۔ یار سچی بات ہے لڑکیاں خود ہی فون کرتی ہیں۔ پتہ نہیں انہیں میرا نمبر کہاں سے مل جاتا ہے۔آرمی آفیسر کا رعب ہوتا ہے نا۔''

''اچھا آج سے یہ موبائل میرے پاس رہے گا آپ نہیں میں سنوں گی''۔

''اوہ مروا دیا، پھر تو سارے پول کھل جائینگے .....لاؤ مجھے دو میرا موبائل۔''

''نہیں دیتی، جو مرضی کر لیں،نہیں دونگی''

عذرا کو آئے ہوئے چار روز ہو گئے۔ اس کے

شوہر کو کہیں نوکری مل گئی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب عذرا لان کے جھولے پر بیٹھی فون کر رہی ہے۔

''شہزادے کیا کر رہے ہو یہ پیچھے لڑکیوں کی آوازیں کیسی ہیں؟ ٹی۔وی لگا ہوا ہے؟ کہاں بیٹھے ہو؟ اچھا نوکری پر ہو۔ بڑی اچھی نوکری ہے ٹی وی دیکھتے ہو تو کام کیا کرتے ہو؟''

''یہ گارمنٹ فیکٹری ہے۔ لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ میں انچارج ہوں حاضری لگاتا ہوں راؤنڈ لگاتا ہوں بس عیش ہی عیش ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''بچو جی۔ اگلے اتوار کو آنا میں تیرے عیش کرواؤں گی۔ چھ ماہ ہوئے ہیں شادی کو اور تم اوروں کے ساتھ۔''

''اوہ تمہیں وہم ہو گیا ہے یہ تو میری ڈیوٹی ہے''۔

وہ اتوار کو ملنے آیا۔ سرونٹ کوارٹر میں ٹھہرا۔ دونوں کی خوب لڑائی ہوئی اس نے موبائیل توڑ ڈالا ''نہ ہوگا یہ نہ میں تجھے فون کرونگی آخر یہ لڑکی کون ہے جو فون کرتی ہے''۔

''یہ میرے دوست کی منگیتر ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ میرا دوست ان پڑھ ہے جب یہ اسے میسج کرتی ہے تو وہ مجھے بھیج دیتا ہے کہ پڑھ نہیں سکتا۔ اور مجھے کہتا ہے تم ہی جواب دے دو بس اتنی سی بات ہے''۔

''دیکھ شہزادے تو مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ قسم کھا تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ..... تو اسے ملا ہے..... ملا ہے نا؟''

وہ اپنے خاوند کیلئے کھانا لینے آئی تو بیگم کرنل نے پوچھا۔ ''کوارٹر سے اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیا تمہاری لڑائی ہوگئی ہے''۔

''ہاں آپی جی''۔

وہ پڑھا لکھا ہے، میں جاہل ہوں، وہ برادری والا ہے، میرے ماں باپ مر گئے، میں اکیلی ہوں، نہ میکہ ہے، نہ کوئی رشتے دار..... وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے سمجھ ہے یہ کام نہیں نبھے گا (روتے ہوئے) آپی وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ آپی زندگی برباد ہوگئی۔ میں کیا کرونگی کدھر جاؤنگی''۔

''ایسی باتیں نہ کرو میں صاحب سے کہہ کر اسے ڈانٹ پلواؤنگی''۔

کرنل صاحب نے پوچھا۔

اس نے بے کم وکاست ساری رام کہانی سنادی۔

وہ مسکرا کر بولے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

خریدا تم نے موبائیل تو دشمن آسماں کیوں ہو

''جب سولہ گھنٹے کے پیکج فری رات کو ملیں گے تو لوگ اور کیا کریں مرد عورتیں ایک دوسرے کو فون ہی کرینگے مرد تو دل پشوری کر لیتے ہیں سمجھتے ہیں کہ اُن کا کیا جاتا ہے۔عورتوں کو حیا کرنی چاہیے''۔

''کیوں حیا کا حکم تو دونوں کیلئے یکساں ہے''۔وہ بولی''غیرت نام کی کوئی چیز حوّا کی بیٹی میں رہ نہیں گئی۔''

بیگم نے ہاتھ بڑھا کر کرنل کا موبائل اٹھایا۔میسج پڑھنے لگی۔

''مائی ڈیر!بات ہی کرلو،بہت مصروف ہو''۔

''یہ کونسی حوا کی بیٹی ہے''۔

''اوہ ہو۔ مجھے دو۔ میں نے کہا ہے کہ میری چیزوں کو ہاتھ نہ لگایا کرو مجھے کیا پتہ کون ہے''۔

بیگم ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

''کیا اس حمام میں سارے ننگے ہیں۔ اِن کو تو پندرہ ہزار کا سوٹ بھی نہیں ڈھانپ سکتا۔یا اللہ! اس قوم پر یہ کیسا زوال آیا ہے۔شیطان نے یہ کیسا فسوں پھونکا ہے۔موبائل ایجاد کرنے والا تو مر مرا گیا ہوگا۔ دجال کا چیلا تھا۔ اپنا وار کر گیا ربِ دو عالم ہمیں بچالے۔''ثمینہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

کیا اس ملک میں کوئی مرد عورت،لڑکا لڑکی،امیر غریب مزدور ریڑھی والا، طالب علم، وزیر،سفیر کوئی اس کے وار سے بچا ہوگا کیا ہمارے ایمان سلامت ہیں۔یا بے حیائی اور بُرائی کی دیمک اسے چاٹ گئی ہے۔

اندر باہر ہے موبائیل
نیچے اوپر ہے موبائیل
آگے پیچھے ہے موبائیل
رات کو سارے سو جائیں تو
زندہ ہوتا ہے موبائیل
پیکیج دینے والو! سوچو
پاگل کرتا ہے موبائیل

☆☆☆

صبیحہ نبوت

رشّو کی نانی

رشّو کو آج نانی اماں کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اب بڑی ہوگئی تھی۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے جب بچوں کو دوسروں کی روک ٹوک بری لگتی ہے۔ وہ اپنے بارے میں کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ اس لیے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ کر راستے بدلتے رہتے ہیں۔

یہی حال رشّو کا تھا۔ وہ اپنے اوپر زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ بال کیسے بنائے جائیں، کپڑوں کا فیشن، جوتوں اور چوڑیوں کی میچنگ، آنکھوں میں کاجل، ہلکی سی لپ سٹک بھی، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے کے انداز۔ بس نانی اماں کو رشّو کی یہی ادائیں ناپسند تھیں۔ بلکہ انہوں نے کچھ زیادہ ہی روک ٹوک شروع کر دی تھی۔

آج آپا کی شادی تھی۔ رشو نے بیوٹی پارلر سے بال بنوائے۔ اچھے اچھے کپڑے، لمبے لمبے بندے پہنے۔ ابھی وہ اپنے سراپا کو آئینے میں دیکھ ہی رہی تھی کہ نانی اماں کی نظر پڑی۔

''رشو ادھر تو آؤ۔ میں بھی تو دیکھوں۔''

یہ سنتے ہی رشو نے نانی اماں کو سلام کیا اور ان کے گلے لگ گئی، بڑی خوش ہو کر بولی'' نانی اماں میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

'' بھئی تم تو ہو ہی اچھی لیکن سر پر یہ گھونسلا نہ ہوتا تو اور اچھی لگتی۔''

''ارے نانی اماں! اس پر میں نے 500 روپے خرچ کیے ہیں آپ اسے گھونسلا کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں پتہ کہ آج آپی کی شادی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے جوڑے پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔

'' بھئی ضرور کرو، لیکن یہ فیشن تو شادی شدہ لڑکیوں پر اچھے لگتے ہیں، کنواری لڑکیاں یہ سب نہیں کرتیں۔ رشو بیٹا! سادگی میں جو حسن ہے وہ اس بناؤ سنگھار میں نہیں اور ہاں ایک بات اور سن لو، نکاح کے وقت تم آپی کے کمرے میں ہرگز نہ جانا۔''

'' کیوں نانی اماں؟''

''بس میں نے منع جو کر دیا ہے۔ ہر بات میں بحث نہیں کرتے۔ اور یہ بات تمہاری سمجھ میں آئے گی

بھی نہیں۔''

''پھر بھی نانی اماں۔'' وہ ضدی بچے کی طرح بولی۔''اگر آپ نے نہیں بتایا تو میں وہاں ضرور جاؤں گی۔''

نانی نے اسے گھورا۔''کنواری لڑکیاں ایسے موقع پر وہاں نہیں جاتی ہیں۔اب سمجھ آیا؟''

''اُف اللہ کنواری کنواری۔ ہر وقت یہی ہوتا رہتا ہے۔'' نانی اماں سے تو کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی لیکن دل میں بڑبڑاتی رہی۔

''اب تو ضرور جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ وہاں پر کونسی ایسی بات ہے۔ نانی اماں تو بس ہر بات میں یونہی کہتی رہتی ہیں۔''

پھر ہوا بھی یہی۔ نانی اماں تو اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں اور رشو نکاح کے وقت آپی کے کمرے میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔تصویریں بھی خوب بنوائیں۔لیکن یہ خلش اسے کریدتی رہی کہ یہاں ایسی کونسی خاص بات ہے جس کے لیے نانی اماں نے یہاں آنے پر منع کیا تھا۔ یہاں کچھ بھی تو نہیں ہے۔صرف کاغذ کے ایک پرزے پر نکاح ہوا۔آپی نے سائن کیے اور بس۔سبھی تو تھے، پھر میرے لیے ہی ہر طرح کی پابندی کیوں ہے؟اب نانی اماں کو نکاح کی تصویریں بھی دکھاؤں گی۔ بڑا مزہ آئے گا۔ دیکھو کیا کہتی ہیں۔کہنا کیا ہے ان کی تو ایک بات ہے، رشو بیٹا جب میں نے منع کیا تھا تو تم وہاں کیوں گئیں؟

یہ سب سوچ کر وہ خوب ہنسی۔اگر میں نانی اماں کا کہنا مان لیتی تو مجھے کیسے پتہ چلتا کہ نکاح کیسے ہوتا ہے۔اب کم سے کم پتہ تو چل گیا۔پھر اس نے اپنے خیالات کو جھٹکا، کیا بے کار باتیں ہیں، کل ولیمہ ہے۔

یہ سوچ کر اس نے الماری کھولی، ولیمے کا جوڑا جو اس نے فیشن کے مطابق بڑے ارمانوں سے بنوایا تھا، نکالا، اپنے اوپر لگایا اور کمرے میں گول گول گھومنے لگی۔'' کتنے اچھے کپڑے ہیں۔بس کل میں یہی پہنوں گی۔''

ابھی وہ اپنے خیالوں میں ہی تھی کہ نانی اماں کی آواز آئی۔''رشو، اے رشو!'' یہ کہتی ہوئی وہ کمرے میں آ گئیں۔''آیئے نانی اماں میرا ولیمے کا جوڑا دیکھیں، کل میں یہ پہنوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ نانی کی طرف بڑھی۔

''بیٹا! میں تو اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتی۔بس تم بھی میرے پاس رہنا۔''

''ارے نہیں نانی اماں! اسلام آباد کونسا دور ہے۔ گاڑی میں جائیں گے، میں آپ کو تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔'' رشو نے بے تابی سے جلدی جلدی بولنا شروع کیا۔ اور گھوم کر دیکھا تو نانی اماں حکم صادر کر کے جا چکی تھیں۔

پھر ہوا بھی یہی۔ نانی اماں اور رشو گھر پر رہیں اور امی اور ابو ولیمے پر اسلام آباد چلے گئے۔ اس دن وہ خوب روئی۔ ولیمے کا جوڑا کتنے ارمانوں سے بنوایا تھا۔ پتہ ہوتا کہ یہ سب ہوگا تو کیوں اتنے پیسے خرچ کرتی۔ آپی کی شادی ہے اور نانی اماں چاہتی ہیں کہ میرا کوئی ارمان ہی نہ نکلے۔ اگر یہ چلی جاتیں تو کیا تھا۔ یہ تو چاہتی ہیں میں گھر میں ہی قید رہوں۔ ہر بات میں پابندی۔ یہاں کیوں گئی، وہاں کیوں گئی، سہیلیوں کے گھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر میرے رسالے اور کتابیں تک پڑھنے پر پابندی ہے۔

''رشو مجھے دو پہلے میں پڑھوں گی۔'' اس نے نانی کی نقل اتاری۔ قمیض تنگ کیوں ہے، دوپٹہ کہاں جا رہا ہے، بال کیوں کھولے، پھول کیوں پہنے، خوشبو کیوں لگائی، جوڑا کیوں بنایا اور آج تو حد ہی ہوگئی۔ آپی کی شادی اور آج ولیمہ اور مجھے ولیمے پر نہیں جانے دیا۔ مجھے اب پتہ چلا کہ یہ صرف میری وجہ سے نہیں گئیں۔

اس کے دل میں نانی کے خلاف بغاوت کا لاوا اُبلنے لگا۔ بس کسی دن ایسا جواب دوں گی کہ پھر پتہ چلے گا۔ یہ پابندیاں آج کل کون برداشت کرتا ہے۔ میری ساری سہیلیاں بھی ان کو اسی لیے سخت کہتی ہیں، لیکن اب کیا کروں؟ کیا جواب دے دوں.....؟ دماغ نے اکسایا۔ نہیں نہیں دل نے سرگوشی کی۔ آخر کو وہ میری نانی ہیں۔ تو یہ پابندیاں کہاں تک برداشت کروں۔ میں بھی تو انسان ہوں میرا بھی آخر دل ہے۔ کیا نانی اماں اپنی جوانی میں فیشن نہیں کرتی ہوں گی۔ ایک دن پوچھوں گی ضرور۔

دل و دماغ کی کشمکش نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی۔ دیکھا تو نانی اماں بڑے مزے سے بستر میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے رشو کو دیکھا تو آواز دی ''رشو بیٹا! کیا تمہیں نیند نہیں آ رہی؟ میرے پاس آ جاؤ۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔''

''ہوں!'' اس نے غصے سے سر ہلایا۔ اس وقت تو بڑی محبت آ رہی ہے پھر وہ کود کر ان کے لحاف میں دبک گئی۔

باہر بڑی ٹھنڈ تھی۔ سرسراتی ہوائیں شائیں شائیں کرنے لگیں۔کبھی بادلوں کے گرجنے اور بجلی کے چمکنے کا احساس بھی ہوتا۔ جیسے ہی بجلی کڑکتی وہ نانی اماں سے لپٹ جاتی اور نانی کا مخمل جیسا وجود اسے سب کچھ بھلا دیتا وہ پیار سے کہتی ''نانی اماں آپ کتنی نرم ہیں جیسے روئی کا گالا یا مخمل کا ٹکڑا۔'' اور نانی اماں خوش ہو کر پیار سے اسے اور چمٹا لیتیں۔

''نانی اماں آپ جوانی میں کیسی تھیں۔'' رشو نے انہیں ٹٹولا۔

''اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔'' نانی اماں نے گہری سانس لی۔

''اچھا یہ بتائیں آپ فیشن کرتی تھیں؟''

''ہاں کیوں نہیں لیکن گھر میں رہ کر پردے میں۔''

رشو کو موقع ملا۔ ''وہ کیسے؟ گھر میں فیشن کرنے کا کیا فائدہ؟ اسکول کالج تو آپ گئیں نہیں اور رشتے دار سب اکٹھے ہی رہتے تھے پھر فیشن کون دیکھتا ہوگا؟''

''بھئی ہم اپنے لیے کرتے تھے سب کچھ۔''

''لیکن اپنے لیے کرنے کا فائدہ؟ اب تو سب کچھ دوسروں کے لیے ہوتا ہے نانی اماں۔'' وہ ان سے لپٹ کر بولی۔

''نا بیٹی نا! یہ شریفوں کے طور طریقے نہیں ہوتے ۔ یوں فلمی ایکٹریس اور شریف زادی میں کیا فرق رہ گیا؟'' وہ زور سے بولیں۔

رشو نے نانی کو غصہ میں دیکھا تو موضوع بدل دیا۔

''اچھا یہ بتائیں آپ نے مجھے آپی کے ولیمے میں کیوں نہیں جانے دیا؟ میں نے بڑے ارمانوں سے جوڑا بنایا ۔ پھر میرا دل آپی کو دیکھنے کو بھی چاہ رہا تھا۔ ان کا جوڑا کیسا ہوگا۔ وہ کیسی لگ رہی ہوں گی۔ مجھے وہ یاد بھی آرہی ہیں۔'' اس کے گرم گرم آنسو نانی اماں کے ہاتھ پر گرے تو ان کا دل پسیج گیا۔

''ارے تم تو رو رہی ہو۔''

''اور کیا نانی اماں۔ مجھے ولیمہ یاد آرہا ہے۔''

رشو بیٹا تم بچہ نہیں ہو، جو بچوں والی باتیں کرتی ہو۔اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ کنواری لڑکیاں ہر جگہ نہیں جاتیں۔ دیکھو نا آپی کے سسرال والے غیر لوگ ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ ہوں گے وہاں پر۔''

''اُف اللہ پھر وہی باتیں۔ نانی اماں میں کونسا پردا کرتی ہوں۔''

''اگر تم پردہ نہیں کرتیں تو ضروری نہیں ہے کہ تم ہر جگہ جاؤ۔ جو جگہ جانے کی ہے بس تم وہیں جاؤ گی۔''

انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔ آنسو پونچھے۔''رونے سے کیا ہوگا،کل آپی آجائے گی دل بھر کے آپی سے ملنا۔خوب باتیں کرنا۔اس سب میں تمہارا ہی بھلا ہے بیٹا۔ جاؤاب جا کر سوجاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ورنہ صبح نماز کے لئے آنکھ نہیں کھلے گی۔''

وہ پھر بڑابڑائی۔''آپ نے مجھے کیوں روکا۔ وہاں اس وقت کتنا مزہ آرہا ہوگا۔''رشو کا دماغ ولیمے میں گھوم رہا تھا''رنگ برنگی روشنیاں ہوں گی۔لہلہاتے آنچل ہونگے۔قہقہے اور چہچہے ہوں گے۔آپی کتنی اچھی لگ رہی ہوگی۔نہ جانے جوڑا کیسا ہوگا۔میک اپ کیسا ہوگا۔''رشوا پنے ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ نانی اماں کے خراٹوں نے سارا طلسم توڑ دیا۔ چپکے سے اٹھی اور کمرے میں جا کر شادی کی تصویروں میں کھوگئی۔

پھر نہ جانے کب رات گئی اور صبح ہوئی کہ نانی اماں نے رشوکو نماز کے لئے آواز دی۔اسے لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔آخر میں نانی اماں نے اس کو ہلانا شروع کردیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا'' ابھی تو میں سوئی تھی۔ اورآپ نے اٹھادیا۔''

''بیٹا! نماز کو دیر ہوگئی ہے۔''جب تک اس نے بستر نہیں چھوڑا نانی اماں تسبیح لیے وہیں ٹہلتی رہیں۔

نماز پڑھ کر رشو نے دوبارہ لیٹنے کی کوشش کی لیکن نانی اماں بولیں''بیٹا!پودوں کو پانی بھی دے دو۔''

''نانی اماں مجھے نیند آرہی ہے میں رات بھر جاگی ہوں۔''ایسا انکار اس نے پہلی دفعہ کیا تھا۔ضمیر نے اسے جھنجھوڑا نانی اماں کو تم نے جواب دیا۔ پھر وہ لیٹ تو گئی لیکن سو نہ سکی۔اسے وہ دن یاد آیا جب نانی اماں نے کہا تھا'' رشو گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرو۔تم اب بچہ نہیں ہو اپنی ماں پر تمہیں ذرا بھی رحم نہیں آتا۔وہ سارا دن کام کرتی ہیں اور تم دیکھتی رہتی ہو۔''

اس دن رشو نے بڑی حاضر جوابی سے کہا تھا''نانی اماں رحم آنا تو ماں کا کام ہوتا ہے۔آپ کو اپنی بیٹی پر رحم آتا ہے اور میری ماں کو میرے اوپر۔وہ مجھ سے کوئی کام کرواتی ہی نہیں ہیں۔''

''لیکن بیٹا! اس بات کا تو تم کو خیال ہونا چاہیے۔''

''نانی اماں مجھے تو کالج کے کام سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔''رشو نانی سے ہار ماننے والی کب تھی۔

گھر کی رونق انہیں دونوں سے دوبالا تھی۔ نانی

اماں کی نصیحتیں اور فضیحتیں رشو کی بے باکی اور حاضر جوابی بعض اوقات امی کے لیے مشکلات کھڑی کر دیتیں۔ جب وہ دیکھتیں کہ محاذ بننے والا ہے تو حالات پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتیں اور بڑی خوبی سے دونوں کے راستے متعین کر دیتیں۔

پھر تعلیم سے فارغ ہو کر رشو کی شادی ہوگئی اور شادی بھی ایک بہت بڑے کنبے میں۔ جہاں ساس، سسر، دیور، جیٹھ، نندیں کچھ شادی شدہ، کچھ بغیر شادی کے۔ غرضیکہ اس کی سسرال میں ہر سائز اور ہر طریقے کے لوگ تھے۔

رشو خالی گھر سے بھرے گھر میں گئی تو اس کو بڑا مزہ آیا۔ طرح طرح کی باتیں، طرح طرح کے کھانے، نہ کوئی وقت نہ پابندی۔ چہل پہل، اپنے اپنے حال میں سب خوش۔

شروع شروع میں رشو خوش رہی لیکن کچھ دن بعد حالات بدلنے لگے سب کا بہوؤں پر ہی زور چلتا ہے۔ اس نے سوچا کتنا عجیب ماحول ہے۔ اپنے گھر میں تو کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ ایک نانی اماں تھیں جن کی روک ٹوک بھی مجھے بری لگتی تھی اور امی، انہوں نے تو کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ سب کچھ نانی اماں پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ کتنی اچھی تھیں میری نانی۔ ہر بات کتنے پیار سے سمجھاتی تھیں۔ اس وقت تو مجھے ان کی ہر بات بری لگتی تھی۔ لیکن کم سے کم نانی اماں کی روک ٹوک سے اب اچھی بری بات کی سمجھ تو ہے مجھے۔ کتنا اچھا کیا انہوں نے جو مجھے ہر بات کی اونچ نیچ سمجھا دی۔ اس لیے ساس کے طعنے اور ان کے اصول اور طور طریقے اسے زیادہ برے نہیں لگے۔

ایک دن رشو اپنے گھر جانے کے لیے اچھی طرح تیار ہو کر ساس کو خدا حافظ کہنے آئی تو وہ بولیں ''رشو بیٹا! آج بدھ کا دن ہے اور ہمارے ہاں نئی دلہن کا بدھ کے دن سفر کرنا اچھا شگون نہیں ہوتا۔''

''کیوں امی جان؟''

''یہ منحوس سمجھا جاتا ہے۔'' اور اس دن سے منسلک پچاس سال پرانے حادثات بیان کرنے شروع کر دیئے۔

''لیکن امی جان! آج تو میری بہت عزیز دوست کی سالگرہ ہے اس میں میرا جانا بہت ضروری ہے۔''

''بس بیٹا! بس میں نے کہہ دیا نا کہ آج تم نہیں جاؤ گی۔ مجھے وہم آتا ہے۔''

''لیکن امی.....!''

ابھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ امی اٹھ کر باہر چلی گئیں اور وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ اتنی وہمی تو میری نانی بھی نہیں تھیں۔ کمرے میں جا کر وہ خوب روئی۔ لیکن اس کی لال اور سوجی ہوئی آنکھوں کا کسی نے نہ پوچھا۔

پھر ایک دن خالہ ساس نے ٹوکا۔ ''دلہن! ہاتھ ننگے نہ رکھا کرو، برا شگون ہوتا ہے۔ اور نہ کبھی لٹھے کی شلوار پہننا۔ یہ غربت کو ظاہر کرتی ہے۔''

''اُف اللہ!'' رشو نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ توبہ توبہ۔ ایسی باتیں تو میں نے پہلی دفعہ سنی ہیں۔

''اور ہاں ایک بات اور سن لو۔ ہمارے ہاں عشرہ کے دن یعنی دس محرم کو چولھا نہیں جلتا۔''

''پھر کیا کھاتے ہیں؟''

''اس دن روزہ رکھتے ہیں۔''

''لیکن چولھا نہ جلنا اور روزہ رکھنا ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔''

''بس تم بحث نہ کیا کرو جو ہمارے دستور ہیں تمہیں بھی انہی پر چلنا ہے۔ یہ سب شروع سے ہوتا آ رہا ہے۔''

پھر وہ بولتی رہیں اور رشو نانی اماں کے تصور میں کھوئی رہی۔ کتنی اچھی تھیں نانی اماں۔ کتنے پیار سے سمجھاتی تھیں۔ لیکن یہاں بس کان کھولے رہو اور زبان بند۔ شکر ہے نانی اماں کے بعد سے میرے اندر کچھ برداشت تو آ گئی ہے۔ اگر میں منہ پھٹ ہوتی اور ہر ایک کو جواب دیتی رہتی تو کتنی لڑائی ہوتی اور میں کتنی بدنام ہو جاتی۔ ہر شخص مجھے برا کہتا۔

اسے آپی کا ولیمہ یاد آیا۔ نانی اماں نے کتنی عقلمندی سے روکا تھا۔ میں اس دن کتنا روئی تھی۔ لیکن شکر ہے نانی اماں کی روک ٹوک نے میرے اندر صبر اور برداشت پیدا کر دیا۔ انہوں نے ہی مجھے زندگی کا طریقہ دیا، سلیقہ دیا، جس سے میرے اندر ٹھہراؤ آیا اور شاید حوصلہ بھی۔ ورنہ اتنے بھرے گھر میں کیسے گزارہ کرتی۔ کیا لڑ لڑ کر رو رو کر یا پھر کسی اور منزل کی متلاشی بن کر۔

اور وہ آنسو پونچھ کر مسکرا دی۔

☆☆☆

مونالیزا

ماں نے بیٹے کو کشمکش اور سوچ میں دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ باہر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ مرے مرے قدموں سے ان کے ساتھ چل پڑا۔

''یہ کیا قصہ ہے احمر؟ کون ہے یہ اور تم کیوں اس کو گھر لے کر آئے ہو؟'' ایک گوشے میں لے جا کر سنبل حیات نے بیٹے سے خاصی خفگی سے پوچھا۔ جواب میں احمر نے انکو اسٹور سے قصہ سنانے کی ابتداء کی تو ان کی بھنوئیں تن سی گئیں، انہیں اپنے بیٹے سے خواہ مخواہ کے فلمی سین کا پی کرنے کی توقع کبھی نہ تھی۔ ''اور پھر تم ہمدردی کا جہاز بنے اس کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے اپنے اوپر سوار کر لائے۔'' انہوں نے حیرت بھرے طنز سے کہا۔ تو وہ نگاہیں چرا سا گیا۔ فوراً اس کو یہاں سے چلتا کرو۔ نہ جانے کون ہے، اور کیا ارادے ہیں اس کے۔ مجھے حیرت ہے تم کو اس سے دلچسپی بھی کیسے ہوئی، سجاوٹ کے بغیر تو تم کھانے کی میز پر بھی نہیں آتے۔'' سنبل حیات نے بیٹے کو سرزنش کرتے ہوئے اس کی عادت یاد دلائی وہ خاصے ضبط سے کام لے رہی تھیں۔ انہیں واقعی احمر پر ناراضگی سی تھی کہ وہ کیوں پرائے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھا ہے اور وہ بھی جس میں اس کے حساب سے بہت کچھ محض ڈرامہ بھی ہوسکتا تھا۔ ''اپنے آپ کو سارا براؤن کہہ رہی ہے اور تم نے دیکھا نہیں گلے میں جو پینڈنٹ پہنے ہے اس میں اللہ لکھا ہے۔ براؤن کی یہ مسلمان بیٹی ہے یا مسلمان بیوی؟'' سنبل حیات کے لہجے میں خاصی چبھن آ گئی تھی۔

احمر نے چونک کر ماں کو دیکھا اس نے ایسا کوئی پینڈنٹ سارا کے گلے میں نہ دیکھا تھا۔ شاید وہ اس سلور لمبی سی چین میں ٹنگا قمیض کے اندر کر دیا گیا ہو جو احمر کی نگاہ نہ پڑی تھی مگر سارا کے ساتھ گزارے گئے وقت میں ماں کی نگاہ نے لمحے بھر میں ہی دیکھ لیا تھا۔ کہ وہ اس پینڈنٹ کو شرٹ سے اوپر نہیں رکھنا چاہ رہی۔

''خیر وہ جو کچھ بھی ہے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں بس تم کو فوراً اسے گھر سے چلتا کرنا ہے'' مگر امی!''

'' کیا مگر امی۔''؟ سنبل حیات نے ابرو

چڑھائے۔

''آپ .....میرا مطلب ہے، ہم اس سے پوچھ لیں، آخر وہ کیوں اپنے گھر نہیں جانا چاہتی۔ ایسے کیسے میں اسے سڑکوں پہ رُلنے چھوڑ دوں۔'' احمر کی آواز میں تیزی آ گئی تھی۔

سنبل حیات نے بیٹے پر گہری نگاہ ڈالی یہ لہجہ، یہ انداز، یہ خیال اسی وقت انسان کا ہوتا ہے جب اس کا کوئی خاص تعلق کسی سے ہو۔ اس راہ چلتی لڑکی کے اپنے بیٹے کے ساتھ تعلق کی سوچ بھی ان کو بری لگ رہی تھی۔ ''ایسا کیا تعلق ہے احمر کا؟'' انہوں نے فکر مندی سے سوچا۔ ''ٹھیک ہے تحقیقات کرلو، اچھی طرح لیکن جلد از جلد وہ یہاں سے چلی جائے تو بہتر ہے۔'' انہوں نے اب کے مفاہمت والا لہجہ اختیار کیا اور قریب رکھا ریموٹ اٹھا کر دیوار گیر ایل سی ڈی آن کرلیا۔

''دیکھو ہم تم کو اس طرح کسی محفوظ ہاتھوں میں حوالے کئے بغیر اپنے گھر سے نہیں نکال سکتے لیکن یہ بھی اچھی طرح جان لو کہ میں چاہوں بھی تو تمہیں کل صبح تک بھی اس چھت تلے نہیں رکھ سکتا یہاں تک کہ میری ماں کو یقین ہو جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے''۔ احمر نے ٹھوس لہجے میں سارا سے کہا جس کی آنکھوں میں اندیشے بے یقینی، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھ کر اس کے پورے جسم پر تن گئی تھی۔

اضطرابی انداز میں مٹھی کھولتے بند کرتے ہوئے سارہ نے لاؤنج سے باہر جاتی راہداری کی جانب دیکھا اور پھر باہر کی دنیا کا تصور کیا تو سرد سی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ احمر نے واضح طور پر اس کو جھرجھری لیتے دیکھا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ بتاؤ گی تو ہی کچھ حل کا سوچا جا سکتا ہے۔'' احمر کی تعاون بھری آواز سن کر اس نے گہری سانس لی اور بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی احمر نے بھی اس کے سامنے والی سیٹ سنبھال لی۔

''بائیس سال کی عمر تک مجھے یقین تھا کہ میں سارا براؤن ہوں۔ تئیس سال کی عمر کو پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ میں سارا براؤن نہیں بلکہ کنول باسط ہوں۔ چوبیسواں سال میں نے حقیقت کی تلاش میں کھپایا۔ پچیسویں سال مجھے پتہ چلا کہ میں نہ سارا براؤن ہوں اور نہ کنول باسط۔ بلکہ ایک بے شناخت وجود جس کو مسز براؤن نے اس وقت گود لیا تھا جب وہ کسی سرکاری ہسپتال میں نوکری کرتی تھیں۔ میں ساتویں لڑکی تھی جس نے اس گھر میں جنم لیا تھا۔ جہاں بیٹے کا انتظار

تھا۔ میرا باپ میری بلکتی ماں کو گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا، اور وہ مجھے قریب کھڑی نرس کی گود میں ڈال گئی تھی جو بے اولاد تھی۔ یوں میں براؤن خاندان میں آ گئی۔ کہتے ہیں میرا آنا اس گھر کے لیے بڑا بابرکت رہا۔ اگلے ہی برس براؤن کو واضح خوشحالی ملی اور پھر اپنی اولاد۔ میری پرورش میں بلاشبہ انہوں نے محبت نچھاور کی لیکن میری نسوانی حرمت کی حفاظت ان کے لیے اہم نہ ہوسکی۔ ''یہ کہتے ہوئے سارا کی آواز گیلی ہوگئی تو احمر حیات پہلو بدل کر رہ گیا۔ ''میں بڑا فخر محسوس کرتی تھی جب مجھ سے وہ کام کرائے جاتے جو میری بہنوں عینی براؤن اور نرا براؤن سے کبھی نہ کرائے گئے۔''

''کیسے کام؟'' احمر کے لہجے میں شبہات اتر چکے تھے جسے محسوس کر کے وہ تلخ سی ہونے لگی۔

''میں نے کسی کے لمحات رنگین نہیں کیے۔'' سارا کا جواب بڑا واضح تھا اور کیٹلا بھی، جسے احمر نے محسوس کیا مگر سکون بھی اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔ ''مجھے ہر طرح کے لباس پہننے پر سراہا جاتا، براؤن مجھے بڑے فخر سے مردوں سے ملواتے، خود دوستیاں کراتے، اور پھر دوستیاں کس دائرے میں رہیں یہ سب ہدایتیں بھی ملتیں۔ وہ شطرنج کا کھیل اچھا کھیل سکتا ہے۔ سوزندگی کی بساط پر بھی اس نے مجھے مہرا بنا کر کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ مگر یہ شکر ہے کہ اس نے مجھے حد میں رہ کر ہدف پورا کرنا بھی سکھایا تھا''۔ یہ بات کہتے سارا کی آواز اتنی دھیمی ہوگئی جسے احمر نے بہت کان لگا کر سنا۔ اب کے اس نے بے آواز قطروں کو فرش پر لڑھکتے دیکھا تو اسے اپنے دل کی دھڑکن میں ارتعاش محسوس ہونے لگا۔ خواب ایک بار پھر زندہ ہو چکا تھا۔ اور خواب کے زندہ ہوتے ہی سارا کے لیے جذبات کی لہریں اس کو اپنی لپیٹ میں لینے لگیں۔

''پھر تمہیں کس نے شبہ میں ڈالا کہ تم سارا براؤن نہیں ہو؟'' احمر کو اپنی سوال کرتی آواز خود اجنبی لگی۔

''اذان نے!''

احمر نے بے یقینی سے اس کا جواب سنا اور دہرایا ''اذان نے! کس طرح؟ تمہارے تو کانوں میں اولین اذان بھی نہیں گئی ہوگی، احمر کا انداز یہ کہتے عجیب ہوگیا تھا وہی جو نسلی مسلمان ہونے پر فخر سے انسانوں کو ہو جاتا ہے۔ سارا نے اپنی جھکی نظروں کو اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نظریں اپنے ہاتھوں پر گاڑ لیں۔

''ہاں بلاشبہ آپ جیسے لوگ اپنے آپ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ کم مائیگی تو ہم جیسے بے شناخت

لوگوں کے حصے ہی میں آتی ہے۔'' اس کی آواز کی شکستگی نمایاں تھی۔ احمر نے اپنی بات پر خاصی شرمندگی محسوس کی۔ اتنے میں قدموں کی آہٹ ہوئی۔

سامنے سنبل حیات منجمد سے تاثرات کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ''میں نے انیکسی کھلوادی ہے۔ باقی تفصیلات کل صبح معلوم کرنا۔ اپنی مہمان کو وہاں شفٹ کردو ..... اور ہاں ..... بچی! اپنا سیل فون مجھے دے دو۔'' احمر کو ہدایات دے کر انہوں نے اچانک سارا کو مخاطب کیا تو وہ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سنبل حیات کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں تو احمر نے عین لمحے پر مداخلت کردی۔

''امی اس کا پرس راستے ہی میں کہیں رہ گیا ہے۔ اس میں سیل فون تھا''۔ اس لمحے سنبل حیات کو اپنا بیٹا بڑا مختلف لگا۔ لیکن کیسا؟ وہ بتا نہ سکتی تھیں۔

''ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔'' انہوں نے توقف کے بعد سارا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تو بے اختیار اس نے کچھ سہمی سی نظروں سے احمر کو دیکھا جو اس کو دیکھ رہا تھا۔ نظروں سے تسلی دیتا ہوا وہ ان دونوں سے پہلے ہی اس منظر سے ہٹ گیا۔ سارا نے اس کو لمبے لمبے قدم اٹھاتے راہداری میں موجود کسی دروازے کے پیچھے غائب ہوتا دیکھا اور اپنی بے چینی پر قابو پاتے سنبل حیات کی جانب قدم بڑھا دیا۔

انیکسی میں اسے چھوڑ کر واپس پلٹتے ہوئے انہوں نے انٹر کوم دبا کر مختصر سی بات کی اور لمحوں ہی میں وہ ہری کانچ سی آنکھوں والی لڑکی نمودار ہوگئی جسے سارا نے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ ''تم آج مہمان کے ساتھ رہوگی ریشم! خیال رکھنا''۔

ریشم نے ایسے اثبات میں سر ہلایا جیسے یہ حکم اس کے لئے اجنبی نہ ہو۔ اجنبی جگہ اجنبی لوگ اور تنہا رات گزرنے کے خیال سے اس کو جو ہول آرہے تھے وہ سنبل حیات بھانپ چکی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے ریشم کو اس کے ساتھ کر کے انیکسی سے باہر قدم بڑھائے۔ ''تمہیں جیسے آسان لگے ایسا کرلو۔ چاہو تو کچھ دیر بعد ریشم کو بھیج کر دروازہ لاک کرلو۔ اور چاہو تو اسے روک لو'' وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولیں تو سارا نے اپنے حلق کو سوکھتا محسوس کیا۔ اس کو کتوں کی خرخراہٹیں بہت قریب سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سنبل حیات کے جاتے ہی ریشم نے بغور اس کو دیکھا اور خود بھی کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹوں بعد واپس آئی تو ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی۔

''آج ہمارے ہاں چائنیز بنا ہے۔ آپ کو پسند ہے؟'' اس نے اس کو کسی بھی القاب کے بغیر مخاطب کرتے ہوئے ٹرے کمرے میں رکھی ٹرالی پر سیٹ کر دی اور پھر اسے گھسیٹ کر اس صوفے کے قریب لے آئی جہاں سارا بیٹھی تھی۔ کتوں کی آوازیں خاصی واضح تھیں جیسے وہ کہیں بہت قریب ہوں۔

''یہ جرمن شیفرڈ ہیں، پاپا جی کو بے حد اعتماد ہے ان کی چوکیداری پر، اس لئے یہ رات کو کھول دیئے جاتے ہیں۔'' وہ احمر کے باپ کے لئے پاپا کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ سارہ نے میکانکی انداز میں سر ہلایا اور کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ بھوک کا واضح احساس اس کو تھا لیکن حلق سے کچھ نگلنا ناممکن لگ رہا تھا۔ دو چار چمچ جلفر یزی کے کھا کر اس نے ٹشو پیپر اٹھالیا۔ ریشم نے بھی کچھ کہے بنا ٹرے اٹھالی اور ایک بار پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اب کے وہ آئی تو سبز خوشبودار قہوہ اس کے پاس تھا۔ سارہ کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے دوسری پیالی خود اٹھالی۔ مجھے کیا دودھ پتی مل سکتی ہے؟'' سارہ کی غیر متوقع فرمائش پر وہ کانچ سی ہری آنکھیں کچھ حیران اور کچھ ناگوار ہوتی لگیں لیکن فوراً ہی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ ایک بار پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ناگوار شاید اس لئے تھی کہ اسے میزبان کے دل میں مہمان کی اوقات کا اندازہ ہو چکا تھا نوکر بھی اسی حساب سے برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ بھی جانتی تھی کہ اس کو خاطر مدارت کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ جو اس نے ہر صورت کرنی ہے۔

سارہ ان آنکھوں کو پڑھ چکی تھی اور خفت سی محسوس کر رہی تھی۔ بھوک سے اس کے پیٹ میں بل سے پڑ رہے تھے۔ مگر کھانا اس سے کھایا نہیں گیا تھا۔ اس لئے چائے کی بے ساختہ فرمائش کر گئی تھی۔

راتیں اس قدر طویل بھی ہو جاتی ہیں، یہ گھر سے باہر رات گزار کر سارہ کو اندازہ ہوا۔ ہر لمحہ چونک کر وہ اٹھ بیٹھتی، ذہن میں موجود خوف اندھیرے کے ساتھ مل کر اس کو نیند سے بوجھل آنکھوں کے باوجود سونے نہیں دے رہا تھا۔ آنے والی صبح کے بعد کے حالات کا خوف اسے سہما رہا تھا۔ جو بھی وہ محسوس کر رہی تھی اس سے گردش کرتی زمین پر کوئی اثر نہ پڑ رہا تھا، اور پھر بلآخر کرہ ارض کے اس حصے میں صبح ہو ہی گئی جہاں سارہ براؤن سانس لے رہی تھی۔ اذان کی آوازیں دھیمی دھیمی سی آ رہی تھیں لیکن سارہ کے اعصاب میں خاصی توانائی آ رہی تھی۔ اس نے سامنے صوفے پر بے سدھ

سوئی ریشم کو دیکھا اور کونے میں موجود واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ دیوار گیر آئینہ میں ابھرتے اس کے عکس پر تھکان واضح تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو بغور دیکھا، یہ چہرہ نہ جانے اسے کیوں اجنبی سا محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے راتوں رات اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی جب اسے اپنی شکل احمر سے ملتی جلتی لگی۔ ورنہ اس سے پہلے براؤن خاندان کی نسل میں سے نہ ہونے کے باوجود اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کی شباہت ان پر ہے۔ پتلا چہرہ اور صبح نکلتے سورج کی اولین کرنوں سا رنگ جو نارنجی سے سنہرے پن کی طرف جا رہا ہو۔ لیکن اب اس رنگ میں ایسی سپیدی اسے گھلی لگی جیسے دھوپ چٹک گئی ہو۔

اپنی سوچ کو جھٹکتے ہوئے اس نے وضو سے فارغ ہو کر ایک بار پھر اپنے عکس کو دیکھا تو اسے بال سنوارنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ باہر آئی تو ریشم اسی طرح سوئی تھی۔ اِدھر اُدھر نگاہیں گھما کر اس نے نماز ادا کرنے کے لیے قبلہ رخ کا اندازہ کرنا چاہا جو کہ ظاہر ہے ناممکن تھا جب تک کوئی آثار یا نشان نہ ہوتا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے ریشم کا بازو پکڑ کر ہلایا تو وہ فوراً ہی اٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور سرد مہری دونوں ہی ابھر آئی تھیں ''قبلہ کس طرف ہے؟''

''اس طرف۔'' ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کر کے وہ پھر بے سدھ ہو گئی۔

سارہ براؤن کے پاس نماز اور خالق کائنات سے تعلق کا کوئی راستہ نہ تھا، اسے اس عبادت کو ادا کرنے کا طریقہ بھی نہ آتا تھا بس جب اس کا دل اپنی اصل کی طرف لوٹنے کو چاہتا، تڑپتا تھا وہ قبلہ رُخ ہو کر لمبے لمبے سجدے کر لیتی۔ سجدے میں بس وہ اللہ! اللہ! کی پکار کو سرگوشیوں میں کہتی رہتی۔ اسے لگتا جیسے کائنات کے ذرے ذرے سے یہ ہی صدا بلند ہو رہی ہو۔ ہر چرند پرند یہ ہی کہتا ہو، اللہ! اللہ!۔

ایم پی تھری پلیئر پر وہ قرات بھی سننا چاہتی لیکن گھر میں بدمزگی کی وجہ سے ہمیشہ اس خواہش کو دبا دیتی۔ لیکن اس وقت اس نے بڑی سہولت سے خوب دل کے اطمینان کے ساتھ سجدے کئے اور کھڑکی پر ڈالے پردے ایک طرف کر دیئے۔ صبح کا نو خیز اجالا کمرے میں دھیرے دھیرے اترنے لگا۔

ایک نگاہ اس نے پیچھے لان پر ڈالی۔ جہاں چیئرز پر احمر بیٹھا نظر آیا۔ شاید اسے سارہ کے دیکھنے کا احساس ہو گیا تھا، بے اختیار اس نے نظر اٹھائی اور مسکرا دیا۔

اس کی مسکراہٹ سے سارہ کو لگا جیسے اجالا تیزی سے پھیل گیا ہے۔ یہ دل کی کیفیت تھی محض کہ لمحوں میں وہ سفر طے ہو گیا جو گزشتہ برسوں میں نہ ہوا تھا۔ احمر اس کے لئے اجنبی چہرہ نہ تھا، لیکن اجنبی شخصیت ضرور تھی۔ مگر اس مسکراہٹ نے جیسے اجنبیت کے تمام پرت اتار دیئے تھے۔ یا شاید اس لئے یہ سب کچھ اسے لگا تھا کیونکہ اس اجنبی جگہ پر ایک وہ تھا جو کچھ آشنا چہرہ تھا۔ جس کی آنکھوں اور رویے میں سارہ براؤن کے لئے عزت تھی۔ باقی سب اسے احمر کی وجہ سے برداشت کر رہے تھے۔ ماں اولاد کی محبت اور خادمہ مالکن کے حکم پر.....ایک زنجیر تھی جس کے ایک سرے پر وہ تھی اور دوسرے سرے پر احمر۔

کھڑکی میں کھڑی وہ اردگرد کے سبزہ کو دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ سورج کا نارنجی رنگ سنہری میں تبدیل ہو رہا تھا اور بتدریج چمکدار دھوپ بن کر پھیل رہا تھا۔ ''اے میرے خدا میرے لئے زندگی بھی عزت کی لکھ دے اور موت بھی'' دل سے شدت سے دعا نکلی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

ریشم بڑی آہستگی سے کمرے سے باہر جا چکی تھی، اسے خبر تک نہ ہوئی، مہذب لوگوں کے نوکر بھی مہذب ہوتے ہیں سارہ براؤن نے مسکراتی آنکھوں سے سوچا، وہ اپنی دراز چوٹی کو کھول کر سنوارنا چاہ رہی تھی۔ کمرے میں موجود ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ میں اس کا عکس ابھرا تھا کہ کمرے میں دستک ہوئی۔ بالوں کو جوڑے کی شکل میں سرعت سے رول کر کے اس نے آنے والے کے لیے دروازہ کھول دیا۔ باہر احمر تھا وہ نہ جانے کیوں سن سی ہو گئی۔ احمر نے اس کی کیفیت کو فوراً ہی نوٹ کر لیا۔

''یہ سیل فون اپنے پاس رکھو اور مجھ سے فون پہ بات کرو۔'' اس نے بنا کچھ اور کہے ایک سیٹ اس کی جانب بڑھا دیا اور خود جانے کے لئے مڑ گیا۔ سارہ کی نگاہ اچانک کمرے کے باہر لگی وال پینٹنگ پر گئی تو اس نے قریب سے دیکھنے کے لیے قدم اس طرف کر لئے۔ پوپی کے بڑے بڑے پھول بنے تھے اور اردگرد Love and Peace لکھا تھا۔ ڈیزائن کوئی خاص نہ تھا لیکن رنگوں پر مہارت غضب کی تھی۔ وہ بغور ان پھولوں کو دیکھ رہی تھی کہ ہاتھ میں پکڑا سیل وائبریٹ کرنے لگا، اس نے چونک کر دیکھا۔ اور تیزی سے کمرے کی جانب بڑھی تو بالوں کا رول جھکنے سے کھل گیا۔ لمبے سیاہ بال اس کی پوری پشت پر پھیل گئے تھے۔

کچھ دور کھڑے احمر نے یہ منظر دیکھا اور رخ موڑ کر کمرے کی جانب چلا گیا۔ سارہ کی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ اس کو کمرے میں بھیجنے کے لیے ہی کال کر چکا تھا سارہ کا باہر ہونا اس کے حق میں بہتر نہ تھا۔ اس لئے اس کے پاس سے ہٹتے ہی جب اس نے بے اختیار کسی احساس کے تحت پلٹ کر دیکھا تو وہ اس تصویر کے آگے کھڑی تھی جو اس کو اس کی کولیگ اور احمر کی محبت میں ڈوبی عیشا علی نے اس کی سالگرہ پر گفٹ کی تھی۔ سارا کی غیر ارادی حرکت سے اس کی خوبصورتی اس طرح عیاں ہوئی کہ وہ بھی نہ جانتی تھی۔ احمر کو لگا یہ مہر تھی۔ جو سارہ براؤن نے اس کے دل پر اپنے نام کی لگا دی ہے۔

انسان واقعی حسن کا اسیر ہے۔ کوئی کسی حسن کا، کوئی کسی، چاہے خود کتنی بھی بدصورتیاں جنم دے لیکن خوبصورت نظارہ اسے اپنا بنالیتا ہے، خالق نے اسے بنایا ہی خوب ہے۔ اور وہ خوبی ہی کو پسند کرتا ہے۔ کب کسی نے کج خلقی یا بدصورتی کو پسند کیا۔ بدصورتی شکل کی ہو یا رویوں کی، کوئی بھی نہیں کہتا کہ ہم اسے اپنانے کو تیار ہیں، سوائے کہ اس کے ساتھ کوئی اور مقناطیس کسی اور خوبصورت اور دلکش پہلو کا منتھی ہو۔

احمر حیات جو اپنے دل کو عمومی چیزوں کے لئے نا قابل تسخیر سمجھتا تھا بلا آخر ایک عمومی لڑکی ہی کا طلبگار ہو گیا۔ لیکن کیا واقعی سارہ براؤن عمومی ہے؟'' اس نے جھنجھلا کر اپنے آپ سے سوال کیا۔

ہاتھ میں فون تھامے وہ سارہ سے بات کرنے کے بجائے اب چند منٹ قبل دیکھے اس کے بالوں کے منظر میں گم تھا۔ ''مونا لیزا کے کیا بال لمبے تھے؟'' وہ ذہن میں آنے والے اس سوال پر مسکرا اٹھا اور گہری سانس لے کر نمبر ٹچ کر کے فون کر کانوں سے لگا لیا۔ سارہ کی آواز ابھری تو وہ بے اختیار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''سارہ! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

پہلا جملہ احمر کا، سارہ کو کیا گنگ کرتا، احمر کو خود حیران کر گیا۔ بے ساختگی اکثر وہی کہلاتی ہے جو دل کی تہوں میں چھپا ہوتا ہے، یہ شاید نہیں بلکہ واقعتاً احمر کی خواہش تھی جو وہ شعوری کوشش سے ٹال رہا تھا لیکن ایسے اچانک الفاظ میں ڈھل گئی کہ دونوں ہی چپ تھے۔ کہنے والا بھی اور سننے والا بھی۔ کتنے منٹ ایسے گزرے کچھ احساس نہ تھا۔

''جذبات کی تلاطم خیز موجوں کے ڈھلتے ہی منظر اور کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے''۔ سارہ کا دماغ اس کو سمجھا

رہا تھا۔

''کیا میں سب کو فیس کر سکوں گا؟'' احمر کا دماغ بھی سوال اٹھا رہا تھا۔ ایک گم نام اور بے نام و نشان لڑکی ہی رہ گئی تھی ہمارے خاندان میں شامل ہونے کے لئے احمر کو لگا ڈیڈی کا لہجہ ٹھنڈا مگر کٹیلا کانوں میں گونج رہا ہے۔ لیکن دل جیسے سارا کے نام کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔

''سارہ احمر'' اس نے بے آواز ہونٹوں سے پکارا تو دوسری طرف سارہ کے بیٹھے بت میں جیسے جنبش ہوئی۔

ہاں میں تیار ہوں، میں اپنے مذہب کی پناہوں میں آنے کے لیے بہت کچھ سہنے کو بھی تیار ہوں بس مجھے طوفانوں میں تنہا نہ چھوڑیے گا، کسی اور کے حوالے نہ کریے گا، ایسے جیسے مجھے دنیا میں آتے ہی شناخت سے بے شناختی کی جانب پھینک دیا گیا تھا.....''

سارہ کی ہچکی بندھ گئی ''میں بہت زیادہ تھک چکی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے سیل فون سارہ کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے لڑھک گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

دوسری جانب سارہ کے رونے سے بے چینی کے عالم میں احمر اپنے کمرے سے باہر نکل کر تقریباً بھاگتا ہوا سارہ کے کمرے کی جانب بڑھا تو ریشم کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کے پیر بندھ گئے۔ اپنے تاثر اور مقام کا خادمہ کے سامنے خیال کر کے وہ رک گیا تھا، سارہ اس گھر میں کوئی خاص یا باعزت مہمان نہیں گردانی جا رہی تھی یہ احمر کو پورا اندازہ تھا، ایسے میں وہ کوئی مزید کہانی نوکروں کے درمیان گردش نہ کرانا چاہ رہا تھا۔

''مجھے طوفانوں میں تنہا نہ چھوڑیے گا میں تیار ہوں! اپنے مذہب کی جانب لوٹنے کے لیے میں ہر طوفان سہنے کو تیار ہوں!'' اچانک اسے لگا سامنے لگے پوپی کے پھولوں کے ساتھ لگے Love and Peace کے بجائے یہ جملے پینٹنگ پر ابھر رہے ہیں، اس کے قدموں نے جیسے جان پکڑ لی اور وہ مضبوط اور لمبے ڈگ بھرتا سارہ کی جانب چل پڑا۔ آنے والے ہر طوفان اور ہر سختی میں اس کا ساتھ دینے کے لیے اور اس کا سہارا بننے کے لیے..... چاہے وہ کنول باسط تھی یا سارا براؤن بہر حال وہ اب سارہ احمر بنے گی انشاء اللہ۔

دل میں پرعزم خیالات کے ساتھ جب اس نے دروازے پر دستک دی تو ریشم کی متجسس نگاہ کی پروا

کیے بغیر اس نے اس کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود سارہ کے پاس دوزانو بیٹھ گیا جو ابھی تک دھیمے دھیمے بے آواز رو رہی تھی۔ خاموش کھڑی ریشم نے شاید اسے چپ کرانے کو کوئی جملہ بھی نہ بولا تھا۔ ناشتے کی ٹرے ایک جانب رکھی تھی۔

''آؤ سارہ! ناشتہ کریں مل کر تا کہ طوفان کا مقابلہ بھی کر سکیں۔''

اس نے اس کے بازو کو ہلایا تو وہ ایسے چونکی جیسے کہیں دور گہرائیوں سے لوٹی ہو۔ احمر کو سامنے دیکھ کر اس کی دبی دبی سسکیاں بند نہ ہوئیں تھیں۔ ''کیا تمہیں یقین نہیں میرا؟'' اس نے بے حد نرمی سے سرگوشی کی اور ایک ناگوار نگاہ سے ریشم کو دیکھا جو کچھ فاصلے پر کھڑی ہکا بکا یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔

''کیا تمیز تمہاری بالکل ختم ہوگئی ہے، کمرے سے باہر جاؤ!'' احمر نے اتنے شعلہ بار لہجے میں ریشم سے یہ کہا کہ وہ سٹپٹا گئی اور فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔

''آؤ سارہ!'' احمر نے اسے پھر پکارا تو اس کی سسکیاں دھیمی ہوتے ہوئے بند ہونے لگیں۔ خوبصورت دراز ہ سیاہ بال اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے، ان کو ایک بار پھر رول کیا تو اس کے بالوں کے درمیان چمکتی مانگ واضح ہوگئی..... سیدھی، شفاف! احمر نے ایک گہری سانس لی۔

سارا براؤن سے سارہ احمر بننے کا سفر اتنا کٹھن نہیں جتنا سارہ احمر بننے کے بعد کا ہے سارہ!'' احمر اس کو کہہ رہا تھا، ''میں پوری کوشش کرونگا کہ طوفانوں میں تمہارے ساتھ کھڑا رہوں، لیکن کبھی تمہیں لگے کہ تم کو میں نے اکیلے چھوڑ دیا تو اللہ پر یقین نہ کم ہونے دینا کیونکہ اسی نے تم کو کبھی تنہا نہ چھوڑا اور مجھے تمہارے لیے مددگار بنا دیا ورنہ ناممکن تھا کہ میں طوفانوں میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میرا راستہ Love + Peace کا تھا نہ کہ Love and fight کا''

۔عیشا علی اور اس کی پینٹنگ کو چشم تصور سے آخری سلام کر کے احمر حیات آنے والے دنوں میں اپنا خواب اور اپنا عہد نبھانے کو سارہ کے ساتھ تیار تھا۔ اسے یقین ہو چلا کہ سارہ کا اس تک آنے والا راستہ بنانے والا خالق سارہ کی لگن کی قدر کرتے ہوئے احمر کو اس کے لئے مسخر کر چکا ہے۔ اب اسے بھی اس کے لئے خیر بننا ہوگا۔

ربّ اپنے سے محبت کرنے والوں کو ناقدروں کے پاس زیادہ عرصہ نہیں چھوڑتا۔ اور اس کی یہ دیسی مونا

لیز ابھی رب سے محبت میں اپنی آرام دہ زندگی سے بد دِل ہوگئی تھی تو اسے احمر کے دل کی ملکہ بنا دیا گیا۔ اگر احمر نے اس کی قدر نہ کی تو اس نعمت کو چھین لیا جائے گا۔ اس سوچ کے ساتھ احمر نے سارہ کے شانوں پر پھیلے دوپٹہ کے پلو کو اس کے سر پر ٹکاتے ہوئے جو کہا، اسے سن کر سارہ کو لگا زندگی آنے والے دنوں میں اگر کوئی امتحان بھی لے گی تو احمر کو رب اس کے مددگار کے طور پر ساتھ ہی رکھے گا۔

''سارہ یہ چادر میں نے تمہارے سر پر ڈالی ہے، اب اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی میری ہے''۔ ایسے الفاظ اس نے اس سے پہلے بھلا کب سنے تھے! ایسا رویہ خالق کا خصوصی انعام نہیں تو اور کیا ہے! رب کی کرم نوازیوں پر اس کے اشک پھر بہہ نکلے۔

''ایک تو یار تم روتی بہت ہو.....ایسا نہ کرو!''

احمر کی بے چارگی بھری آواز پر اس کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ دھوپ بارش کا یہ ملن دونوں ہی کو شاد کر گیا۔

☆☆☆

الشافی کلینک

مشورہ یہ ہے کہ آپ پہلی فرصت میں اپنا سر اوکھلی سے نکالیں اور موج کی گنگا میں ہاتھ دھوئیں، فوری افاقہ محسوس ہوگا.....ایک نادر نسخہ

پچھلے کچھ دنوں سے میری طبیعت ناساز تھی ہمارے گھر کے قریب ہی ایک نیا کلینک، الشافی کلینک کے نام سے کھلا تھا۔ میرے میاں مجھے وہاں لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ میرے میاں نے انھیں اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''محترمہ! کیا تکلیف ہے آپ کو؟''

میں نے کہا۔

''کبھی کبھار مجھے اختلاج قلب کی شکایت ہوتی ہے۔ ٹھنڈے پسینے آتے ہیں۔ تھکاوٹ کا احساس رہتا ہے، سر چکراتا ہے، آنکھوں کے سامنے کبھی اندھیرا چھا جاتا ہے، کبھی دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں تو کبھی رات کو سورج نظر نہیں آتا، کبھی ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں اور کبھی ایک ایک کے بجائے دو دو چیزیں نظر آتی ہیں، کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ جو کبھی کبھار شائیں شائیں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ٹانگوں پر لرزہ طاری رہتا ہے۔ گلے میں نزلہ گرتا ہے۔ کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔''

ڈاکٹر صاحب سب علامات بہت توجہ اور شوق سے سنتے رہے۔ جوں جوں علامات کی فہرست طویل ہوتی جارہی تھی، ان کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں جیسے کسی انجانے کو دیکھ کر تھوڑے سے غور وفکر کے بعد اچانک اسے پہچان لیا جائے، یا جیسے کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی ہو یا جیسے کسی پیچیدہ معمے کا کوئی سرا ہاتھ آ گیا ہو۔ وہ زیر لب مسکرا کر کہنے لگے۔

''میں نے آپ کی بیماری کی جڑ پکڑ لی ہے۔ دراصل آپ سوچتی بہت ہیں لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کیا سوچتی ہیں اور کیونکر سوچتی ہیں۔ سوچنے کے لیے تو دماغ چاہیے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر حیرت سے پوچھا۔

''دماغ ہے آپ کے پاس؟''

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی فرمانے لگے۔

''کیوں نہیں ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ جب آپ کی گردن پر سر موجود ہے تو اس کے اندر ضرور کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ دماغ سے تو بڑے بڑے دانشور سوچتے ہیں، ادیب سوچتے ہیں، مفکر سوچتے ہیں، علماء اور رہنما سوچتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رہزنوں کو بھی سوچنا پڑتا ہے۔ معاف کیجیے گا، میرا خیال ہے کہ آپ کا تعلق مذکورہ بالا انسانی گروہوں میں سے کسی گروہ کے ساتھ نہیں۔ پھر آپ کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ سوچیں آپ کے دشمن بی بی! آپ اپنے اسکولوں، کالجوں کی طرف نظر دوڑائیں۔ ان کا تعلیمی ڈھانچہ کسی ذہن کا مرہون منت نہیں۔ مختلف دفاتر کو لیجیے۔ وہاں سارا دن کام ہوتا رہتا ہے لیکن کسی ذہنی کاوش کے بغیر۔ اپنے ملک کے سب اداروں کو دیکھ لیجیے۔ کسی بھی ادارے میں آپ کو دماغی کارکردگی نظر نہیں آتی۔ اس کے باوجود سب کچھ حسب معمول چل رہا ہے۔

دیکھیے جو لطف سوچے سمجھے بغیر زندگی بسر کرنے میں ہے وہ سوچ سوچ کر کڑھ کڑھ کر گزارنے میں نہیں۔ کبھی اپنے دماغ کو سلا کر زندگی کے معمولات ادا کرنے کی کوشش کیجیے۔ مانا کہ اس حال میں چستی غائب ہو جاتی ہے۔ کاہلی، بے حسی، نیند اور نشے کا سا غلبہ ہونے لگتا ہے لیکن اس خود فراموشی کے اپنے مزے ہیں، اس غنودگی میں انتہا کی لذت ہے، اس مدہوشی میں سکوت و ثبات پوشیدہ ہے، اس بے خودی کے عالم میں جو سرور حاصل ہوتا ہے اور جو لذت طاری ہوتی ہے اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

آپ میری روشن مثال لے لیجیے۔ میں اس وقت آپ کے سامنے دماغ کو استعمال کیے بغیر کام کر رہا ہوں اور میری اندرونی کیفیت، کیا کہوں آپ سے، آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتیں۔ آپ خود کوشش کیجیے۔ خود اس خوبصورت تجربے کے عمل سے گزریں۔ دیکھیے! ایک شاعر کا بہت اچھا شعر ہے جسے میں نے حسب حال تھوڑا سا بدل دیا ہے۔

اچھا ہے ''جسم'' کے ساتھ رہے
پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ
دے

ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے کہ عقل والوں کے لیے ''سوچاں ہی سوچاں'' اور بغیر عقل کے ''موجاں ہی موجاں'' آپ کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ پہلی فرصت میں ہی اپنا سر اوکھلی سے نکال لیں اور موج کی گنگا میں ہاتھ دھوئیں۔ آپ فوری افاقہ محسوس کریں گی۔ یہ افاقہ عارضی بھی ہوسکتا ہے اور مستقل بھی۔ اس کا کلی انحصار آپ کے رویے اور عمل پر ہے۔

میری میاں بہت غور سے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپ گفتگو سن رہے تھے۔ وہ کہنے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب! دراصل یہ کچھ لکھ رہی ہیں، اس لیے ان کو سوچنا پڑتا ہے۔''

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب چونک اٹھے، وہ اپنی کرسی سے اچھلے، حیرت سے میرے میاں کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا۔

''جناب! کیا فرمایا آپ نے؟''

پھر انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یعنی یہ لکھتی ہیں۔''

یہ کہہ کر انھوں نے قہقہہ لگایا۔ ان کی آنکھوں سے بے یقینی اور تحقیر کے جذبات جھلک رہے تھے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔

''بی بی! آپ کے پاس لکھنے کے لیے کیا ہے؟ یہ تو فارغ لوگوں کا کام ہے کہ زندگی کے اہم معمولات کو نظر انداز کر دیا، دنیا سے قطع تعلق کر کے، کمرے میں بند ہوکر بیٹھ گئے اور لکھتے چلے گئے۔ آپ کو تو اپنی بیماریوں سے ہی فرصت نہیں۔ بھلا آپ کیا لکھیں گی۔ ہاں البتہ اپنی انواع و اقسام کی بیماریوں کا موضوع پر آپ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو قلمبند کر سکتی ہیں۔ مثلاً بیماری کی آمد آمد کا یقین، بیماری کی پوشیدہ اور ظاہری علامات، پرہیز کے نقصانات، پرہیز نہ کرنے کے فوائد، ورزش سے اجتناب، دواؤں سے بے نیازی، مرغن کھانے سے رغبت، وقت بے وقت کھانا کھانے کی خواہش، ڈاکٹر کی ہدایات کے برعکس عمل کرنے میں راحت۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اپنا علاج خود کرنے کی اہمیت اور کتاب کے آخر میں نتائج۔ لیکن کتاب کے آخری باب آپ صرف بشرطِ زندگی لکھ سکتی ہیں بصورتِ دیگر یہ باب آپ کے میاں بھی لکھ سکتے ہیں۔

ارے ہاں یاد آیا کہ آپ کی سہولت اور رہنمائی

کے لیے میں آپ کے لکھنے کے لیے ایک اور موضوع بھی تجویز کیے دیتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کھانا پکانے کی تراکیب لکھ سکتی ہیں۔اس سلسلے میں وسیع علم اور مہارت کی کوئی شرط نہیں۔ بے دھڑک لکھیے، بلا جھجک لکھیے، آنکھیں بند کر کے لکھیے۔آپ کی لکھی ہوئی تراکیب جب قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی اور وہ ان کو سامنے رکھ کر کھانا پکائیں گے تو وہ خود ہی طے کر لیں گے کہ آیا آئندہ وہ اس کھانے کو دوبارہ پکانا، کھانا اور کھلانا پسند کریں گے یا نہیں۔ یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیجیے، خود زحمت نہ کیجیے گا۔

لیجیے صاحب! اس سلسلے میں ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ آپ کو بھلا اس موضوع پر لکھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ انٹرنیٹ پر ملک ملک کے کھانوں کی تراکیب با آسانی مل جاتی ہیں۔ مارکیٹ میں بھی اس موضوع پر لکھی گئی سینکڑوں کتابیں دستیاب ہیں۔ پھر ٹی وی کے ہر چینل سے روزانہ اس بارے میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ جب پہلے ہی کئی لوگ یہ خدمت بہت بہتر انداز میں انجام دے رہے ہیں تو پھر بھلا آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ اپنے ذہن پر زور دیں۔ بلکہ آپ کو کس نے یہ حق دیا ہے کہ اپنا اور لوگوں کا وقت ضائع کریں۔ بس آپ آج سے لکھنے لکھانے کا شوق ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں۔ یہی آپ کا علاج ہے اور اسی میں قارئین کا فائدہ ہے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔اس پر لکھا تھا۔

''دوا کی ضرورت نہیں۔ مریضہ اپنے ذہن کو کم سے کم استعمال کریں اور قلم ہاتھ میں پکڑنے سے مکمل پرہیز کریں۔شفا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

☆☆☆

میری لائبریری سے

کتاب کا نام : کلام مینؔا
مصنفہ (شاعرہ) : بنت مجتبیٰ مینؔا
پبلشر : منشورات

امت مسلمہ کے پہلو میں ہزار ہا انعامات واکرامات ہیں جن میں سب سے بڑی نعمت ''امت محمدیہ'' کا اعزاز ہے۔ حضرت محمدﷺ کا نام لینے پر ہی اللہ دس نیکیاں بڑھا کے دس گنا ہوں کی بخشش کا اعلان کرتا ہے باقی حساب کتاب خود کرلیں۔ ہاں آپؐ کا عرب میں پیدا ہونا دو نمایاں وجوہات کی بناء پر تھا۔ ایک تو یہ کہ محبوبؐ خدا کی دعوت کو قبول کرنے والوں کا ''یکسو'' ہونا، منافقت اور دوغلے پن سے پاک ہونا۔ اس لیے ماننے والے اصحاب کا لنجوم (میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں) ٹھہرے اور نہ ماننے والے ابولہب ابوجہل۔ درمیانہ راستہ عربوں کے پاس نہیں تھا۔ دوسری صفت، عربوں کا فصیح اللسان ہونا ہے۔ اس فصاحت وبلاغت میں شاعرانہ مزاج بھی شامل تھا۔ آپؐ کی فصاحت وبلاغت پر تو ایک زمانہ کیا خود عرش والا بھی رطب اللسان ہے۔ روایات میں ہے کہ آپؐ نے ایک صحابی سے فرمائش کی کہ فلاں شاعر حکیمانہ اشعار کہتا ہے کوئی شعر (اس کا) یاد ہو تو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا۔ آپؐ نے فرمایا اور سناؤ وہ صحابی کہتے ہیں۔ حتیٰ اَنشدُّ ت مأ تہ بیت (یہاں تک کہ میں نے سو اشعار سناڈالے) سیرت کی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ چوبیس صحابہ کرام خود شاعر تھے۔ خود سیدہ عائشہؓ اشعار کو سننا پسند کرتی تھیں اور ان کے دو شعر زبان زد عام ہیں (سیرت کے پروگرام کے لئے میں نے تو ضرور سنانا ہوتے ہیں)

لناشمس ولِلآفاق شمس
وشمسی خیرٌ مِن شمسِ السّمآء
فان الشمس تطلع بعدالفجر
وشمسی طالع بعدالعشاء

(ایک میرا سورج ہے اور ایک آسمانوں کا سورج ہے، میرا سورج آسمان کے سورج سے زیادہ بہتر ہے، آسمان کا سورج فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے اور میرا سورج عشاء کے بعد) جی جناب! آمدم برسر مطلب! ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ آج شاعری کی کوئی کتاب ہے۔

کتاب کا نام ''کلام مینا'' اس ہستی کا کلام جو نمود ونمائش، ریاکاری سے کوسوں دور اور اصلی حسبی نسبی شاعرہ تھیں۔ ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کے ضمن میں اگرچہ شاعری کا دامن اتنا وسیع نہیں پھر بھی چند ایک نام ہی سب پہ بھاری ہیں۔ بنت مجتبیٰ مینا نے بہت کم شاعری کی لیکن

ان کا ہر شعر انگوٹھی میں جڑا نگینہ ہے۔ روانی، سلاست ترنم یہ سب ان کی شاعری کے بنیادی لوازمات ہیں۔ یہ کتاب مجھے سال گزشتہ میں منشورات کے زبیر عابد صاحب کے توسط سے ملی تھی اور میری کتابوں کی الماری میں تبصرہ کی منتظر!

بنت مجتبیٰ مینا بہت اچھی نعت نگار بھی تھیں۔ صرف نعت نگار نہیں ہنر مند نعت نگار، ایسی زندہ نعت کہنے والی کہ ہر لفظ زندگی سے بھرپور۔ آئیں نعت سے پہلے ان کے چند حمدیہ اشعار سے باقاعدہ آغاز کریں۔

یہ زمیں دیکھوں آسماں دیکھوں
تری قدرت کہاں کہاں دیکھوں
مری آنکھوں میں یوں بسا ہے تو
تو ہی تو ہے جہاں جہاں دیکھوں
تو عظیم تر ہے گمان سے
تو قریب تر رگِ جان سے
تو دکھی دلوں کے قریب ہے
تجھے ڈھونڈتے ہیں کہاں کہاں

نعت مقبول سے چند اشعار

وہ ہے بحر سخا وہ ہے گنج عطا
وہ دعائے خلیل اور حبیب خدا
اس کی شانِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
یہ جی میں ہے کسی صورت تمہارے در پہ جا پہنچوں
وہی دیوار و در دیکھوں مدینے کی زمیں چوموں
نظریں اٹھا کے گنبدِ خضرا کو چوم لوں
آنسو گرا کے نقشِ کفِ پا کو چوم لوں
میں کیا کروں مولا میرے بس میں کچھ نہیں
طیبہ کے ذرہ ذرہ کو، صحرا کو چوم لوں

کچھ نعتیہ اشعار اتنی مختصر مگر مترنم بحر میں ہیں کہ جی جھوم جھوم جاتا ہے۔

وہ ہمارے نبیؐ
سب سے پیارے نبیؐ
کیا برا کیا بھلا
سب بتایا ہمیں
ان پہ جاں ہے فدا
وہ حبیب خدا

اور

ان کا آنا کیسا آنا
جیسے چمکا چاند افق پر
ان کی خوشبو ہر سو پھیلی
پورب پچھّم دکھن اتر
ان کی جود و سخا کا عالم
کہیے مینا کہیے مکرر

شاعر کے نام کو مقطع میں استعمال کرنے کا ہنر کیا اس سے اچھا بھی ہوا ہوگا؟

ایک بڑے سے بڑا افسانہ نگار کوزے کو سمندر میں تبدیل اور شاعر سمندر کو کوزے میں بند کر سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ قطعات۔

؎ گرمیوں میں کسی مسافر کو
جیسے دوپہر ہوتی جاتی ہے
بس اسی طرح سے یہ عالم ہے
زندگی قہر ہوتی جاتی ہے

؎ جوں ہی اس کو اذن سفر ملا
میرے خاک داں سے گزر گیا
میری چشم نم رہی ڈھونڈتی
وہ کہاں گیا ؟ وہ کدھر گیا

؎ جانے کس واسطے آئے ہیں تری دنیا میں
جانے کب جانے کی آجائے ہماری باری
پھر یہی بات کتابوں میں لکھی جاتی ہے
سب اسی بات کو دہراتے ہیں باری باری

اپنا ماضی ہر کسی کو محبوب نہیں ہوتا کوئی تو اسے عذاب قرار دیتے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ بنت مجتبیٰ مینا کا ماضی کس قدر شاندار تھا۔ اس کی یاد کس طرح آتی ہے؟

؎ کیوں بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں اک بوند چھلک کر آتی ہے
کچھ بھولی بسری سی شکلیں ہر سمت دکھائی دیتی ہیں
اک لرزش اک چمکارہ سا ہوتا ہے نظر کے دامن میں
آنسو سے ٹپکنے لگتے ہیں آہیں سی سناتی دیتی ہیں

بہت پہلے پروفیسر فروغ احمد مرحوم سے شاعروں کا تذکرہ ہوا تو کہنے لگے ''اگر شاعروں کی شاعری پڑھتے ہوئے ان کا کردار سامنے رکھا جائے تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے اردو شاعری کا دامن تنگ ہی ہے۔ سوائے چند ایک ناموں کے جنہیں ترقی پسند ''بڑا'' قرار نہیں دیتے۔''

خیر ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ بڑے شاعروں کی عظمت کا سرٹیفکیٹ تو روز حشر اللہ ہی دلوائے گا بس یہ قطعہ پڑھ لیجیے۔

؎ ذکر حضورؐ پاک پہ قربان جایئے
ٹکڑے ہزار دل کے حضوری میں لایئے
پلکوں کا فرش راہ گزر میں بچھایئے
دل کے لہو سے شمع محبت جلایئے

چراغ راہ میں شائع ہونے والی نظم کے اشعار دیکھئے:

؎ ساز ہستی پہ کوئی گیت نہ گایا میں نے
قہقہہ کیا تبسم بھی نہ پایا میں نے
مجھ کو الجھائے رہی عقل وخرد کی گتھی
مطربِ شوق کہاں ساز بجایا میں نے
زندگی ٹھہر ذرا اور ابھی ٹھہر ذرا

بنت مجتبیٰ مینا کی شاعری ہلکے ہلکے سروں میں دھیمے دھیمے سوز کے رنگ ہیں۔

؎ نہ لائے کوئی یہاں شمع آرزو ورنہ
حریم دل کے یہ مہمان جاگ جائیں گے
نہ چھیڑ دیدۂ مینا چھلک اٹھیں گے ندیم
الم کدے کے نگہبان جاگ جائیں گے

؎ ہم کہہ نہ سکے تم سن نہ سکے
جو بیتی دل پہ بیت گئی
جب بگڑے سمجھو بنتی ہے

جب ہارے جانو جیت گئی

ہاں ذات کا دکھ اپنی جگہ وطن کی بات ہمیشہ امید سے کرتی ہیں۔ان کی نظم ''پہلی کرن'' کیا جاندار ہے۔

؎ کیا اندھیاری چھٹ جائے گی
تاریکیٔ غم مٹ جائے گی
کیا شام الم کٹ جائے گی
سچ کہنا ارے یاران وطن
چمکی ہے افق پہ پہلی کرن

پھران کی کچھ اور نظمیں ''غازیانِ تازہ دم، کس کی آواز ہے یہ، ہلال عید'' زبردست پیغام لیے ہیں۔

؎اے ہلال عید پیغام خوشی لاتا ہے تو
یادلِ خوں گشتۂ مسلم کو تڑپاتا ہے تو
تو یہاں آتا ہے شاید مسکرانے کے لئے
یہ جہاں آنسو نہیں ملتے بہانے کے لئے
تو ہمارا ہے تو پھر انداز بیگانہ ہے کیوں؟
اے ہلال عید یہ طرز جداگانہ ہے کیوں؟

ان کی طویل نظم ''کس طرح مسکراؤں'' واردات قلبی سے بھرپور ہے۔حالات حاضرہ کو سالوں پہلے نظم میں سمو کر پیش کیا۔ آج بھی انہی حالات کی ترجمان ہے۔ان کی نظموں بلکہ شاعری کا اپنا رنگ ہے تاہم ''اک لڑکی، ہارسنگھار'' وغیرہ میں ابن انشاء کی شاعری کی جھلک ہے۔انہوں نے اپنے بچپن کو ''میں اکثر سوچا کرتی ہوں۔'' میں ایسی خوبصورتی سے سمویا ہے کہ پڑھنے والے پر سحر طاری ہوجاتا ہے۔

ان کی زندگی کو ذہن میں لاؤں تو سوچتی ہوں ان کی شاعری زیادہ نکھری نکھری ہے یا ان کی شخصیت۔

''رات گزر جائے گی'' میں زندگی کے اسرار و رموز ملتے ہیں۔''لاہور کی مٹی'' مختصر سی نظم۔

؎لاہور کی مٹی ہے سوا تاج محل سے
اس مٹی کی خوشبو تو کہیں اور نہیں ہے
رہتے ہیں یہاں بھی کئی دیوانۂ الفت
لاہور بھی اس رسم میں پیچھے تو نہیں ہے

آپا جی حمیدہ بیگم کے انتقال پر، بنت الاسلام کی وفات کی خبر سن کر اور مولانا مودودی کی رحلت پر کہے اشعار دل کی داستان سناتے ہیں۔

اپنے بھائی کی شادی پر کہے سہرے کے اشعار کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ پورا شجرۂ نسب بیان کیا ہے۔ان کی شاعری میں ہر لفظ اپنی مثال آپ ہے۔غزل حسن و عشق کے رنگوں پر محیط ہے تو نظموں میں نغمگی کی اپنی ہی شان ہے۔ بنت مجتبیٰ مینا نے اپنی زندگی میں قلم کو بس شاعری کے لئے نہیں استعمال کیا انہوں نے افسانے، مضامین جو بھی لکھا خوب لکھا۔ ماہنامہ نور کی سالہا سال سے مدیرہ تھیں اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو چلایا۔

؎اس حسنِ پاکباز کی آتی رہے گی یاد
نور سحر کے ساتھ کبھی چاندنی کے ساتھ

غنچہ نا شگفتہ کی طرز نے رکھ لیا بھرم
ورنہ حیاتِ لالہ رنگ داغ ہی داغ ہے تمام

اگلے ماہ تک کے لئے فی امان اللہ.....بشرط زندگی! ☆☆

رشیدہ صدف

قندیلِ روشن

تم تو گلاب تھیں.....وہ خوشبودار، تر و تازہ پھول، جس کے سامنے ہر پھول ہار مان لیتا ہے.....محبت میں لپٹی ایک نم آلود تحریر

رخسانہ طارق کو ہم سے جدا ہوئے تین ماہ ہونے کو ہیں مگر کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ اس کے نام کچھ لکھا نہ ہو، کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ اس کو یاد نہ کیا ہو اس کے لیے دعائیں نہ کی ہوں، روزانہ ہی چاہا اُس کے نام کچھ نذر کروں، اس کی باتیں، حسین یادیں قلم و قرطاس کے حوالے کروں مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگتی کہ لکھنا مشکل ہو جاتا، چند جملے ڈائری کے حوالے کر کے اُٹھ جاتی۔

زندگی میں بہت ہی پیارے رشتے اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے، کبھی ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی، دل کے عین وسط میں ایک انگارہ سا مسلسل دہک رہا ہے۔ اعصاب پہ مسلسل ایک دباؤ ہے، سوچ کی مرجھائی شاخ پر کسی خیال کی کوئی کونپل نہیں پھوٹ رہی۔ پھر قلم پر گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ جانتی ہوں یہ دنیا ایک سرائے ہے اور ہر مسافر کو اپنا سفر مکمل کر کے منزل حقیقی کی طرف لوٹنا ہے۔

میری ہمدم، میری ساتھی رخسانہ طارق لاہور کے شعبہ بیت المال کی نگران اور ایک زون کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے آن ڈیوٹی ربِّ اعلیٰ کے بلاوے پر لبیک کہتے کہتے رخصت ہو گئیں اس کی سحر انگیز شخصیت کے حضور عقیدت کے چند پھول پیش کر رہی ہوں تا کہ ایسے زندۂ جاوید کردار کی امنگ دلوں میں پیدا ہو!

میرا واسطہ سینکڑوں لوگوں سے ہے تحریکی، غیر تحریکی، مگر اپنی اس تحریکی ساتھی کے ساتھ جو روحانی اور قلبی تعلق تھا وہ عجیب ہی تھا، سمجھ نہیں آتا کیا نام دوں، نہ خون کا رشتہ، نہ نسب کا، بس ایک رشتہ تھا محبت کا، پیار کا، سب اچھی طرح جانتے ہیں جو پودا اپنے ہاتھوں سے لگایا ہو، دن رات اس کی رکھوالی کی ہو، اُس کی آبیاری کی ہو مالی کو وہ کتنا محبوب ہوتا ہے اپنی اولاد کی طرح!

؎ لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے گزری سحر کو میں
اُس صبح کو کیسے بھلاؤں جب میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی پیاری بجیا کو، اپنی من موہنی بہن کو نہلا دھلا کر، غسل دے کر، دلہنوں کی طرح بنا سنوار کر لٹایا،

کلمہ شہادت اور دعائے مغفرت کرتے ہوئے رخصت کیا..... یہ محبت کا طویل سفر، یہ 35 سالہ رفاقت یہ خوبصورت راستہ کٹ گیا، پل بھر میں، لمحوں میں، ایسی اجنبیت کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا اور نہ ختم ہونے والے سفر پہ روانہ ہوگئی، بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ جانے والے کب مڑ کر دیکھا کرتے ہیں!!

کاموں کو بکھیرتے، سمیٹے، تیزی تیزی سے رختِ سفر باندھ لیا اور چل پڑی۔ یہ بھی نہ دیکھا کون تنہا رہ گیا، اس نے تو منزل کو پالیا اب ہم کو بلاوا آنے ہی والا ہے، قطار میں لگے ہیں۔ بس رحمٰن و رحیم رب ہمیں معاف کردے۔

صبح کے وقت کی برکتوں کی وہ عملی قائل تھی، ہر کام کو صبح ہی صبح ترتیب دے لیتی، ضروری اور اہم کام جلدی جلدی نبٹا کر نہا دھو کر بیٹھ جاتی تھی کئی بار اس کے گھر جانے اور رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو چراغِ سحری تھی، صبح کا تارہ تھی، صبح کو نہ خود آرام کرتی نہ کسی کو سونے دیتی تھا نیداروں کی طرح سب کو کام میں لگا دیتی اُس کو دوسروں سے کام لینا بھی خوب آتا تھا۔ سستی و کاہلی کو سخت ناپسند کرتی، نئی نسل کی لاپرواہی اور سستی اس کا ہر ضوع ہوتا فکرمندی ہوتی کہ ان کا کیا بنے گا۔

بڑوں کا احترام تو سب ہی کرتے ہیں، اپنے سے اونچے کو سلام کرنے کی ریت بھی دیکھی ہے مگر اپنے سے چھوٹے کی تکریم، ان کی عزت کرنا رخسانہ کو خوب آتا تھا، انسان دوست ایسی کہ ہر ملنے والا سمجھتا بس میری ہے، یہ بھی ایک فن ہے جو ہر کسی کو نہیں آتا۔ اُس کے حلقۂ یاراں میں بڑے بوڑھے، جوان بھی تھے اور چھوٹے بچے بھی۔

مجھے جب بار بار استاد کہتی اور دوسروں کو بھی میرا تعارف بھاری بھرکم الفاظ سے کراتی تو میں شرم سے جھک جھک جاتی، میں کہتی میں نے خود رخسانہ کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا ہے، مشکل کو آسان کہنا میں نے اُس سے سیکھا وہ ہر کام کو چٹکیوں میں آسان بنا کر پیش کردیتی تھی اُس کی زندگی منضبط تھی، یہ منظّم زندگی تھی کہ آٹھ بچوں کے ساتھ گھر کو صاف ستھرا رکھنا، بروقت ہر کام کو نمٹانا، شوہر کو خوش رکھنا، شوہر پاس ہے یا ملک سے باہر یکساں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اور پھر مہمانداری، تحریکی ذمہ داریاں بھی نبھانا اتنا سہل نہیں ہوتا، بے شک ہر دور میں ایک دو کام والیوں کو ساتھ رکھا، اللہ نے اس کو مالی لحاظ سے آسودگی دے رکھی تھی، اللہ کے دیئے ہوئے مال کو خرچ بھی خوب کرتی تھی،

مال کو رحمت اور امانت سمجھ کر رکھتی تھی۔

جب سے اس کی ترجیحات بدلی تھیں رک رک کر اپنی نیت کو درست کر لیتی تھی زندگی میں کئی مدو جذر آئے، خشک وتر حالات دیکھے، آزمائشوں سے گزری مگر نہ تھک کر بیٹھ گئی اور نہ کبھی مایوس ہی ہوئی۔ بلکہ وہ تو گرے ہوؤں کو کھڑا کرنے والی تھی۔

اس نے زندگی کا وہ دور بھی بھرپور گزارا جب وہ اس کتابِ ہدایت سے ناآشنا تھی، نورِ ہدایت سے بہرہ ور نہ ہوئی تھی، دنیا کی رنگینیوں میں گم تھی، جزا وسزا کی قائل نہ تھی بس موج، میلہ مستی کی قائل تھی، یہ شوخ چنچل الٹرا ماڈرن دوشیزہ بیاہ کر لاہور جیسے رنگین شہر سے چھوٹے سے قصبے جلال پور میں آئی تو اس نے محسوس کیا جیسے کھلے سمندر سے کنویں میں آ گئی ہو۔ آزاد پنچھی کو حسین پنجرے میں بند کر دیا ہو، بے شک نیک صالح شوہر ملا تھا، سب نے عزت دی تھی ناز نخرے اُٹھا رہے تھے کہ دلہن خوبصورت بھی ہے، پڑھی لکھی بھی ہے، لاہور شہر کی بھی ہے، لیکن رہن سہن بالکل جُدا تھا، مزاجوں میں نسبت نہ تھی۔ کئی بار اُس کا دم گھٹتا، آزاد فضاؤں میں اُڑنے والی یہاں گھبرا سی جاتی، مگر یہ دابو قسم کی نہ تھی نہ ہی خود کو لہروں کے حوالے کر دینے کے قائل تھی، بلکہ دوسروں کو پیچھے چلانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

بہت جلد اُس نے خود کو سنبھال لیا اُس نے پورے ماحول کو بھانپ لیا، حالات کو بدلنے کیلئے خیالات کو بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ رخسانہ جو خود چادر اور چار دیواری کو رجعت پسندی کی علامت سمجھتی تھی، اُسے چادر اور دوپٹے والی پینڈو لگتی تھیں، سادگی کو وہ جہالت سے تعبیر کرتی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ نندوں نے اثر قبول کرنا شروع کر دیا، گھر کا رنگ ڈھنگ بدلنا شروع ہو گیا، بڑے بزرگوں کو یہ تبدیلی کھٹکنے لگی، رویوں کا تصادم فساد پیدا کرتا ہے۔ نجانے معاملہ کتنا بڑھ جاتا، انہی دنوں رخسانہ کے ساتھ مجھے چند نشستوں کا موقع ملا، بس اس کا میرے ساتھ ایسا دل لگا، ایسی دوستی بنی جو آخری لمحہ تک باقی رہی۔ پھر اللہ نے ان ملاقاتوں کو ثمر آور کر دیا مجھے یاد آتا ہے میں کس طرح راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس کی ہدایت کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ پھر ایک دن میرے رب نے میری التجائیں سن لیں، رخسانہ نے قرآن کریم، فرقانِ حمید کو ترجمہ وتفسیر سے پڑھنا شروع کر دیا، ذہین تھی مطالعہ کی عادت تھی، قرآنی آیات کا

مفہوم ذہن میں اُترنے لگا۔ دل کی دنیا اُتھل پتھل ہونے لگی، سوال پیدا ہونے لگے۔ وہ روزانہ قرآن پڑھنے آتی اور گھنٹوں سیکھتی، حالانکہ ان کا گھر ہمارے گھر سے کافی دور تھا، یہ اس کی منظّم زندگی کا خاصہ تھا کہ گھر میں اپنے حصے کا کام ختم کر کے وقتِ مقررہ پر پہنچ جایا کرتی، بچوں کو بھی پورا وقت دیتی، بلکہ بچوں کے بارے بہت حساس تھی، کچھ چیزیں ، کچھ عادات قدرے مشترک تھیں بہت سی مختلف تھیں لیکن پھر بھی اختلاف رائے ضرور ہوتا جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ یہ راستہ تو ہے صبر وثبات کا۔

اب اس کی سوچ کے دھارے بدلنے لگے، زاویۂ نگاہ بدل گیا، اس کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آ گیا، اس کے دل کی دنیا ہی بدل گئی، ایسی کایا پلٹ گئی کہ اس تبدیلی کو روبہ عمل لانے کے لیے اُسے ایک کشمکش اور ایک جنگ سے گزرنا پڑا۔ تاہم رخسانہ کی مستقل مزاجی اور پرزور گفتگو، اور دل میں اتر جانے والا انداز اور خود عملی نمونہ ان سب نے جلد ہی سارے خاندان کو ہمنوا بنا دیا۔ پھر وہ نہ صرف خود تبدیل ہوئی بلکہ اپنے عزم راسخ اور دینی حمیت سے ماحول کو بدل دیا۔ نام نہاد روشن خیالی اور جدت پسندی سچے دین کے سامنے نہ ٹھہر سکی، رسول پاک ﷺ کے قولِ مبارک کے مطابق جو دورِ جہالت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوئے۔ رخسانہ طارق نے اپنے حُسنِ اخلاق، حُسن کردار اور حُسنِ معاشرت سے ہر ایک کو گرویدہ بنالیا، جب کسی دل میں اللہ کی محبت کا پھول کھل جاتا ہے تو پھر کوئی اس کی پتیوں کو ملغوف نہیں کرسکتا، جس گھر میں اسلام کی روپہلی کرنیں منور ہو جاتی ہیں تو دلوں کی تاریکیاں خود بخود چھٹ جاتی ہیں۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کا مرحلہ درپیش ہوا تو جلالپور سے لاہور شفٹ ہوگئی مگر قرآن سیکھنے سکھانے کا یہ سلسلہ جاری رہا، تب خط آدھی ملاقات کا ذریعہ ہوا کرتے تھے، خطوں کا سلسلہ جاری رہا، اجتماعیت سے تعارف تو بن چکا تھا لیکن باقاعدہ شامل ہوکر کام کرنے کی قائل نہ ہوئی تھی۔ جب ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہوا، محفلیں نہ ملیں تو پھر بے قرار ہوگئی، وہاں اُڑتی ہوئی آتی، اس طرح پھر تحریکی ساتھیوں سے ملاقات ہوئی بالآخر جماعت میں باقاعدہ شامل ہوگئی۔ قرآنی کلاسز لینے لگی پھر سے تعلیم وتعلم کا رشتہ جُڑ گیا۔ اب میں نے سکھ کا سانس لیا، لٹریچر پڑھنے سے ذہن کا کینوس وسیع ہوا، شعور وآگہی کے در کھلنے لگے، دنیا اور دنیاداروں کی

حقیت کھل کر سامنے آنے لگی۔

ماشاء اللہ اللہ نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں، بڑی بہن جو کینسر سے اس دنیا سے جا چکی تھی اس کے بھی دو بچے پاس تھے، آٹھ بچوں کی پرورش اور تربیت کا کام ایک بھاری کام تھا، مگر وہ کبھی بھی گھبراتی نہ تھی اُن یتیم بچوں کا خیال اپنے بچوں سے زیادہ کرتی تھی۔

اب اپنی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں اور اردگرد ملنے جلنے والے، دوست واحباب کو بھی جہنم سے بچانے کی فکر دامن گیر تھی۔ وہ ہر کام کو بہترین انداز اور حدِ کمال تک کرنے کی قائل تھی۔ اس کام کے لیے اس کی مضبوط منصوبہ بندی بھی ہوتی اور منظّم کوشش بھی۔ بچوں کی تعلیم وتربیت اُس کی ترجیح اول تھی، وہ ہمیشہ کہتی میں بہت سے گھرانوں کو جانتی ہوں جو والدین تو دین پر ہیں اور بچے بالکل آزاد۔ میں ایسا بالکل نہیں چاہتی، میں اللہ کے سپاہی تیار کر رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی دوسروں کو رستے پہ ڈالتے ڈالتے خود گھر کا رستہ بھول جاؤں۔ رشیدہ مان لو! میں رکنیت کا حلف اُس وقت لوں گی جب میرے بچے بھی میرے راستے پر ہوں گے۔

پھر الحمد اللہ سب بچے ہمنوا بنے شعوری حلف لیا پھر ذمہ داریاں پڑیں تو خوب نبھائیں، اور آج یہ کھیت کھلیان خوب ثمر آور ہے۔

سب بچے شادی شدہ ہیں۔ بچوں کی شادیوں کے سلسلہ میں بھی جہاد کیا۔ زندگی میں مشکل ترین مرحلہ بچوں کے رشتوں کا ہوتا ہے ان اَن دیکھے رستوں پر چلنے کا انجام کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر اُس نے بڑی جرأت سے حسب نسب کی پروا کیے بغیر تحریکی رشتوں کو ترجیح دی، شوہر باہر دوسرے ملک تھے رخسانہ بڑے بڑے جرأت مندانہ قدم لے لیتی تھی، کتنی بہادر تھی وہ، یوں لگتا تھا ہر مرحلے پر تائید ایزدی اُترتی رہی۔ اکثر کہا کرتی تھی میرے کام تو اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا یہی کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے کی بات ہے جب حج کر کے واپس آئی تو بیمار ہوگئی مختلف ٹیسٹ ہوئے تو پتہ چلا کینسر ہے۔ اس پر ہم سب بہت ہی پریشان ہوگئے، ہر رشتہ دار رویا، پریشان ہوا جھولیاں اُٹھا اُٹھا کر سب دعائیں کرنے لگے اُس کے لئے اُس کے بچوں کے لئے۔ اُس کی زندگی کی بھیک مانگی، میں جتنا پریشان ہوتی اتنا ہی وہ بات کو مذاق میں اُڑا دیتی، کہتی بس رونے کے لیے تیار ہو جاؤ، بس انعم،

رحمہ کی شادی کرلوں، میں بالکل فارغ ہوں، بس تم مجھے بتاؤ میرے مرنے پہ کونسی کتاب بانٹنی ہے؟ کفن تو میں نے خرید کر رکھ لیا ہے۔ دونوں بچیوں کو بھی شادی کے کپڑوں کے ساتھ کفن بھی لے کر دیا تو عروج نے کہا مجھے کیوں کفن نہیں دیا تھا، مجھے بھی کفن لے کر دیں۔ پھر عروج بیٹی کو بھی کفن کا کپڑا لے کر دیا۔ موت کا ذکر تو اب اکثر ہی رہتا تھا شاید اسی لئے اپنے ہر کام کو جلدی جلدی کر رہی تھی، بیماری کو سوار نہیں ہونے دیا۔ اس بیماری میں اور بہادر ہوگئی تھی، واقعی قابلِ رشک زندگی اور قابلِ رشک موت ہوئی۔

کون، کس لمحے بچھڑ جائے کسے معلوم ہے؟
جانے والوں کے لیے تو کوئی بھی موسم نہیں
میں دیکھتی تھی وہ مسلسل موت کی تیاری میں ہے جیسے موت کو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ ہمیں ہی سمجھ نہ آسکی، مجھے ہر دوسرے دن لمبے لمبے فون کرتی آخری فون بھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا کیا۔ موت تو ہمارے اردگرد ہی گردش کرتی رہتی ہے امر ہونے پر دبوچ لیتی ہے اور ہم کہہ اُٹھتے ہیں ہائے اتنی جلدی! پتہ ہی نہیں چلا، یہ حادثے یہ بیماری، یہ بالوں کی سفیدی، اعضا کی کمزوری ..... یہ سب موت کے سند لیے ہی تو ہیں، نہ سمجھیں تو الگ بات ہے۔

یہ حسن یہ جوانی ہمیں دھوکے میں ڈالے رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''اے انسان! تجھے کس نے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے'' اور ''اے انسان تو تو کشاں کشاں اپنے رب کیطرف چلا جا رہا ہے''۔

کاش ان حقیقتوں کا ہم سب کو ادراک ہو جائے آمین۔ بے شک جو بھی قرآن سے جڑ جاتا ہے زندگی اور موت کے فلسفہ کو سمجھ لیتا ہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی گزارتا ہے۔

رخسانہ! تم تو گلاب تھیں وہ خوشبودار، تروتازہ پھول جس کے سامنے ہر پھول ہار مان لیتا ہے، تم تو حسین موتیوں کی ایک لڑی تھیں، تم تو قندیل روشن تھیں نہیں تم تو چمکتا ہیرا تھیں۔

تم ہر مجلس کی جان ہوتی تھیں، جہاں بیٹھ جاتیں محفل سج جاتی۔ تم تو مایوس دلوں کی امید تھیں، کتنے ہی گرنے والوں کو تم نے سنبھالا دیا، سیدھا رستہ دکھایا، ٹوٹتے بکھرے آشیانوں کو بچایا، ہر کسی کی خیر خواہی کرنا اس کے لئے وقت دینا، مال لگانا، سمجھانا یہ سب کچھ تم بہت ہی احسن طریقے سے کر لیتی تھی۔ تم تو میری بے

لوث محبت تھیں۔

زندگی بھی شان سے گزاری اور جنازہ بھی بہت خوبصورتی سے اُٹھا، اتنے آرام سے دعاؤں کے سائے میں، سنت انداز میں، یہ دو موقعے بڑی آزمائش کے ہوتے ہیں، میں نے دوسری مرتبہ اتنی متانت اور وقار سے جنازہ اُٹھتے دیکھا ہے۔ ایک خالہ جان نیئر بانو کا اور ایک اب رخسانہ طارق کا۔

آنکھیں اشکبار تھیں مگر زبان پر مسنون دعائے مغفرت کے کلمات تھے، لاہور کی ساتھی بہنیں پہلے بھی تعزیت کے لئے آئیں رات کو بھی تھیں، ایک بڑے خاندان کا سمندر تھا، خوبصورت گواہیاں تھیں، مغفرت و بخشش کی استدعا تھی اور مالک کی صفتِ عدل پر پورا یقین تھا۔

چند دن پہلے میری رحمہ بیٹی سے بات ہوئی بڑی ایمان افروز باتیں زندگی بخشنے والی باتیں، دو دفعہ ثاقب بیٹا ملنے آیا اور اب کل ہی عروج بیٹی سے بات ہوئی کہنے لگی ہم بہن بھائیوں نے خاص امی کے لیے صدقۂ جاریہ کے طور پر ایک قرآنی کلاس شروع کی ہے انعم بٹ ہمیں آن لائن قرآن پڑھا رہی ہے ہم بہن بھائیوں اور خاندان والوں کے علاوہ 30 مزید لوگ اس کلاس میں شامل ہو گئے ہیں۔

اور آنٹی جان! ہم نے وراثت کا مال قرآن کے آئینے میں تقسیم کیا ہے، یہ کام بحسن وخوبی ابو جان کی موجودگی میں طے پا گیا تھا۔ اور انٹی! ابو جان اپنے نائیجیریا جانے سے پہلے 50 لاکھ کی خطیر رقم (سرحد کے امیر سراج الحق صاحب کی وساطت سے) مسجد و مدرسہ کے لیے لگا کر گئے ہیں۔ یہ ادارہ دِیر میں بن رہا ہے۔

ثاقب بتا رہا تھا جن علاقوں میں پانی کی قلت ہے ایسے آٹھ مقامات پر پانی کا انتظام کروایا ہے، دسواں، چالیسواں جیسی بدعات پر خرچ نہیں کیا، سوچ سوچ کر صدقہ جاریہ کے لیے رقوم لگائی ہیں۔

عروج بتا رہی تھی سارا وقت امی کی باتیں، نصیحتیں خوشبو کی طرح ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ سب کے جذبات کچھ ایسے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی خاندان میں کبھی فیشن رخسانہ سے چلا کرتا تھا، پھر دین کے چلن کا جھنڈا بھی اُسی نے بلند کیا اب سنتوں کو زندہ کرنے کی طرح اولاد نے ڈالی ہے بے شک! پھر رحمہ کہنے لگی آنٹی یاد ہے ایک طغرہ امی کو آپ نے دیا تھا جس پر مولانا کا قول لکھا تھا امی خود بھی دہراتی رہتیں اور ہمیں بھی رٹا دیا تھا'' طولِ حیات کے بے بنیاد بھروسے پر

اپنی اصلاح میں دیر مت کیجئے بے شک اللہ کا خوف ہی ہر بھلائی کا سرچشمہ ہے''۔

آنٹی یہ جملہ تو ہمارے جسم و روح کا حصہ بن گیا ہے۔

رخسانہ طارق کی کہانی تو مکمل نہ ہوئی نہ ہوگی البتہ اس کے بارے کچھ لکھنے کا قرض ضرور ادا ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تمام سعی و جہد کو قبول فرمالے۔ اس کی قبر کو اپنے نور سے منور فرما دے، باری تعالیٰ جنت کے میووں سے اس کی میزبانی کرے اور آبِ کوثر سے سیراب کرے اسی طرح کی تمام خوبصورت دعاؤں کے ساتھ میری دوست میں تمہیں اللہ کی امان میں دیتی ہوں۔

☆☆☆

نفسِ گرم سے ہے گرمی احرار

کوئی یونہی تو عزیزِ جاں سے عزیزِ جہاں نہیں بن جایا کرتا! ملت کے حدی خواں قاضی حسین احمد کی یادیں

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

(وہ دل جو عشق کی بدولت زندہ ہوگیا، کبھی موت سے ہم کنار نہیں ہوتا۔ ہماری ہمیشگی صحیفہ عالم پر قائم ہو چکی ہے)

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہی موت ہے۔ لیکن وہ جنہیں زمین کا نمک کہیں یا پہاڑی کے چراغ۔ دنیا سے جانے کے بعد بھی دلوں سے کب جاتے ہیں بھلا؟؟ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہر دور میں ایسے انسان پیدا کرتا رہا کہ یہ ملت کبھی بھی حُدی خوانوں سے خالی نہیں رہی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی پہاڑی کے ایسے ہی ایک چراغ تھے جن کے بارے میں اقبالؔ نے فرمایا تھا کہ

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

ایسا ہی گرمئ احرار رکھنے والا ایک نفسِ گرم جس کی جدائی کو پورا ایک برس بیت گیا۔ اور اس گزرے برس کے ہر دن نے یہ احساس دیا کہ قاضی حسین احمد (مرحوم جن کو لکھنے پر قلم ایک بار بھی آمادہ نہیں ہوتا) صرف پاکستان ہی کے نہیں، پوری امت مسلمہ اور ساری انسانیت کا سرمایہ اور میراث ہیں نہ صرف ایک بے باک قائد بلکہ زمانہ ساز مدبر، اقبال کے شاہین سے مشابہ ایک نئے دور کے نقیب یہ اس امت پر اللہ کا خصوصی فضل وکرم ہے کہ یہ امت اپنے کسی دور میں سچے اور باعمل داعیوں اور مبلغوں سے خالی نہیں رہی۔ تاریخ اسلام ایسے ہی جگنوؤں سے جگمگا رہی ہے جو ظلمت شب میں بھی امید کا پیغام ہیں۔ ان چمن کی دیدہ ور شخصیتوں پر تحقیق ہوتی رہے گی تجزیے رقم کیے جاتے رہیں گے ہم بھی ایک عہد کی گواہی ہیں اور اپنی اس گواہی کو آنے والے کل کے سپرد کرنا ہماری ذمہ داری! ورنہ ان کی شخصیت تو اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ آنے والے زمانوں میں ان پر بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا میں

اس وقت چند ذاتی مشاہدات میں ''قارئین بتول'' کو شریک کرنا چاہتی ہوں۔

ان دنوں دل کی تکلیف کے باعث قاضی صاحب آئی سی یو میں زیر علاج تھے۔ میں سندھ کی ذمہ داری کے حوالے سے اندرون سندھ کسی ضلع کے دورے پر جارہی تھی۔ میں نے حیدرآباد ایک بہن کو ڈراپ کر کے بقیہ آگے کے سفر کے لیے دوسری بہن کو گاڑی میں بٹھانا تھا۔ حیدرآباد سے ایک قدرے ضعیف رکن جماعت بہن بقیہ سفر میں میری شریک سفر ٹھہریں۔ ابتدائی دعا سلام کے بعد انہوں نے قاضی صاحب کی خیریت دریافت کی۔ میں نے کہا کہ میں تو صبح سویرے نکل گئی تھی گھر سے۔ آج اخبار دیکھ نہیں سکی ہوں۔ وہ اس قدر فکرمند تھیں قاضی صاحب کی خیریت کے لئے جیسے ان کے گھر کا کوئی فرد ہسپتال میں ہو۔ مجھے ان کی فکرمندی پر بڑا رشک آرہا تھا اور اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ بولیں اس وقت قاضی صاحب امت کی امیدوں کا مرکز ہیں یکدم وہ ان کا ذکر کرتے کرتے آب دیدہ ہوگئیں۔ بولیں آیئے دعا کر لیتے ہیں قاضی صاحب کی صحت کے لیے مسافروں کی دعائیں بارگاہ الٰہی سے رد نہیں کی جاتیں۔ سو ہم دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے وہ دعا کرتی تھیں میں آمین کہتی جاتی تھی۔ اس قدر رقت ان پر طاری تھی کہ کیا بتاؤں۔

ہم کچھ دیر بعد منزل پر پہنچ گئے۔ تنظیمی دورے کے بعد ان کو حیدرآباد ڈراپ کرتی ہوئی میں کراچی دوسری بہن کے ہمراہ آگئی۔ یہ واقعہ میرے ذہن پر نقش ہوگیا۔ میں سوچتی رہی کہ اس پورے دورے کا حاصل تو بس یہی واقعہ ہے۔

میں نے قلم اٹھایا اور قاضی صاحب کے نام ایک خط لکھ دیا کہ ان کے لئے دعا کرنے والے کتنے دل ہیں۔ کتنے ہاتھ ہیں۔ کتنے مخلص کارکن ان سے کتنی والہانہ وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ خط لکھ کر میں نے حوالۂ ڈاک کر دیا۔

چند ایک دن گزرے کہ ان کی بیٹی سمیعہ راحیل کا فون آیا کہ ابو تو پشاور شفٹ ہوگئے ہیں ہسپتال سے۔ ان کی ڈاک جو گھر پر آتی ہے آپ کا نام لفافے پر دیکھ کر میں نے ابو جان سے پوچھ کر آپ کا خط کھول لیا۔ پھر میں نے ان کو آپ کا خط سنایا فون پر کہ یقیناً جو میرے احساسات ہیں اس سے بڑھ کر آغا جان کے احساسات ہونگے۔ وہ خط سن کر بولے کہ تمہاری امی بہت پریشان ہیں ان کو بھی خط سنا دو۔ تب وہ بولے کہ

میں لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تم میری طرف سے بہت دعاؤں کے ساتھ جواب لکھ دو، خط کو فائل میں لگا دو۔ سمیعہ بولیں کہ محترم آغا جان نے دوبارہ مجھے فون کر کے پوچھا کہ تم نے شکریہ ادا کیا کہ نہیں تو میں نے کہا کہ جی میں نے فون تو کر دیا تھا جواب آپ خود ہی لکھیے گا تندرست ہو کر۔ بعد ازاں ملاقات پر راحیل بولیں کہ آپ کا خط تو بہت ہی احساسات سے لبریز تھا آغا جان تو معمولی احساسات کی بھی بہت قدر کرتے ہیں۔ وہ تو گھر کے بچوں تک کے احساسات و جذبات کا اتنا خیال رکھتے ہیں جیسے وہ کوئی کانچ کے برتن ہوں کہ ضرب نہ لگ جائے۔

اور واقعی میں نے اس کو محسوس کیا کہ وہ لمحے جو میری ان سے قیّمہ پاکستان کے ہمراہ واحد بالمشافہ ملاقات تھی میرے ذہن پر ان کا ایک ایک لمحہ روشنی کی طرح نقش ہے۔ سفید براق لباس چہرے پر جاہ وجلال، لہجہ میں پٹھانوں کی مخصوص کرختگی کے بجائے انتہائی ملائمت۔ اور اپنے دیر سے آنے پر معذرت کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ پھر انتہائی تسلی سے گفتگو سننا۔ بار بار حوصلہ افزائی کے کلمات کہنا کہ مجھے بہت قدر ہے حلقہ خواتین محدود وسائل کے باوجود ہر محاذ پر سرگرم عمل ہے۔ بار بار مردانہ بیٹھک سے بلائے جانے کے باوجود انہوں نے عجلت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا جب کہا گیا کہ صحافی انتظار کر رہے ہیں تو دوٹوک جواب دیا کہ ''صحافیوں کو انتظار کرنا چاہیے۔ پہلے خواتین کی بات ختم ہو جانے دیں''۔

وہ نصف گھنٹے کی ملاقات کیسے ایمان وایقان سے سرشار کر گئی تھی اور ''قیادت'' کے تصور کو مجسم شکل میں دیکھ کر کیسا دل باغ باغ تھا۔ دل باغ باغ تو ان کے خطاب سے بھی ہو جاتا تھا چاہے وہ اجتماع ارکان میں ہو یا شوریٰ میں۔ جیسے بھی سوالات ان سے پوچھ لیے جاتے وہ نامناسب سوالوں کا بھی ہمیشہ تسلی بخش جواب دیتے۔ خواتین جو ملکی حالات یا جماعت کی پالیسی پر کچھ سمجھنا چاہتیں بعض اوقات تنقیدی اور تند و تیز سوالات بھی پوچھ لئے جاتے میں نے ان کی کبھی ردعملی گفتگو نہیں سنی۔ وہ ہمیشہ مثبت اور نئی سوچ عطا کرنے والا خطاب کرتے ہمیشہ عزم اور امید کی طرف بلاتے۔ چاہے موضوع جو بھی دیا جاتا ان کو خطاب کا لیکن ان کی ہر گفتگو ذکر الٰہی کی گفتگو ہوتی۔ اقبال کے اشعار کو اس قدر ولولے کے ساتھ وہ پڑھتے کہ لگتا تھا کہ انہی کے لیے کی گئی ہو یہ شاعری۔ یوں گمان ہوتا تھا کہ حافظ

اقبال بھی ہیں! اکثر فارسی اشعار سناتے تو ساتھ ساتھ ترجمہ بھی ضرور کرتے۔ خواتین ان کی صحت کے حوالے سے کبھی سوال کرتیں تو ہمیشہ یہی کہتے کہ ''ان کی صحت کی فکر نہ کریں۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کچھ نہ ہو گا۔ تحریک ہمیشہ قائم رہے گی۔ ہم اپنے جذبے تحریک کو دے کر جائیں۔''

اور وہ چند ساعتیں بھی میری یادوں کے البم میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ جب مرکزی شوریٰ کا اجلاس تاخیر سے ختم ہونے پر ایئر پورٹ جاتے جاتے بہنوں کی خواہش ہوئی بیگم قاضی حسین احمد کی عیادت کر لی جائے۔ ان کی بیماری کی اطلاعات تھیں ان دنوں۔ رات کو کوئی دس بجے کا وقت تھا۔ دائیں ہاتھ کے کمرے سے راھد اری میں یکدم قاضی صاحب برآمد ہوئے۔ وہی سفید براق لباس، جناح کیپ۔ تیزی سے راھد اری عبور کرنے لگے۔ کہ ایک بہن نے با آواز بلند کہا کہ ''قاضی صاحب السلام علیکم'' وہ تیز قدموں سے چلتے چلتے اچانک پلٹ آئے۔ با آواز بلند سلام کا جواب دیا۔ اور چند ثانیے رک کر پھر تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ میں سوچنے لگی کہ وہ سلام کا جوب تو چلتے چلتے بھی دے ہی سکتے تھے۔ لیکن سلام کا جواب رک کر دیا، پھر چند لمحے توقف کیا، پھر اپنی راہ لی۔

کراچی کی وہ بہنیں جنہوں نے یوں براہ راست قاضی صاحب کو کبھی اس طرح نہ دیکھا تھا اس قدر شاداں و فرحاں تھیں جیسے بیٹیوں نے ایک عرصہ بعد باپ کو دیکھا ہو!! میں نے ان کی بہو سے سوال کیا کہ محترم امیر جماعت کی صحت تو خود اچھی نہیں ہے وہ رات تک اتنا مصروف کیوں رہتے ہیں؟ وہ بولیں کہ آغا جان جب تک جاگتے رہتے ہیں وہ سب کو دستیاب ہوتے ہیں۔ بالخصوص دارلضیافہ میں آنے والے مہمان جس وقت بھی آئیں اور قاضی صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کریں وہ فوراً حاضر ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر وقت آن ڈیوٹی رہتے ہیں۔

اس پر بیگم قاضی حسین احمد گویا ہو سکیں کہ، جماعتی مصروفیات سے فارغ ہوتے ہیں تو اپنا لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ نہ فارغ رہتے ہیں نہ رہنے دیتے ہیں۔ اب کوئی ''عزیز جاں'' یوں ہی تو ''عزیز جہاں'' نہیں ہو جایا کرتا، یہی تو ہوتے ہیں عباد الرحمٰن۔ اسلام شخصیت کی تعمیر اسی انداز میں چاہتا ہے۔ مولانا مودودیؒ ہوں یا میاں طفیل محمد مرحوم و مغفور یا قاضی

حسین احمد مرحوم۔ جہاں جہاں اسلام ایک زندہ قوت بن کر ابھر رہا ہے اس میں ان عظیم رہنماؤں کے جذبے اور عمل کی روح کارفرما ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں نہ کرتے زبان تھکتی ہے نہ سنتے ہوئے سماعتیں سیر ہوتی ہیں۔ضرورت ہے کہ کہنے سننے، بیان کرنے اور لکھنے لکھانے سے آگے کچھ کر گزرنے اور کر دکھانے کی تاریخ دھرائی جائے۔ اگر کسی اعلیٰ درجے کے کردار سے ہمارا تعلق ہمیں خود کو بدلنے پر مجبور نہ کرے تو کیسا تشنہ ہے وہ تعلق؟ یہ اعلیٰ کردار فی الواقع ہمیں خود کو بدلنے کی دعوت دیتے ہیں ایک سوز دروں پیدا کرتے ہیں۔ کہ دنیا کی زندگی کو بس ''متاع قلیل'' ہی سمجھو۔ ان صاحب عزیمت لوگوں کے کردار ہمیں انقلاب کی دعوت دیتے ہیں کہ فرد کے بدلنے سے ہی معاشرہ انقلاب پذیر ہوگا۔ کیا اس عظیم کردار کی تپش نے مجھے سلگنے پر مجبور کیا۔ ورنہ تو اقبالؔ کا گلہ مجھ سے ہی ہے کہ:۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی سے ملاقات

ڈاکٹر صاحبہ اسم با سمیٰ ہیں۔ان کے نام نے ان کی زندہ دل شخصیت پر خوب رنگ جمایا ہے۔شگفتگی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ ہمیشہ تر و تازہ گلاب کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔ بیک وقت کئی محاذوں پر کام کر رہی ہیں۔آپ پیدائشی لکھاری ہیں۔شعور آنے کے ساتھ ہی افسانے لکھنے لگیں بعد میں طب کی دنیا میں قدم رکھا۔ پیشہ کی مصروفیات نے ان کے ادبی کام کو معطل کرنے کی بجائے اور زیادہ بڑھا دیا۔عشق اور مشک چھپے نہیں رہتے۔ افسانہ نگاری ان کا عشق ہے اور خدمتِ خلق مشک، رہی شاعری تو وہ فی البدیہہ ہے۔ڈاکٹری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پاکستان سے لے کر آسٹریلیا تک ان کی خوشبو پھیل چکی ہے۔ دنیا کے سولہ ممالک کی سیر کر چکی ہیں۔ان کے تجربات اور مشاہدات ہمیں ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ اب تک تیرہ کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔آپ ویمن کونسل آف وکٹوریہ (آسٹریلیا) (MWCV) کی نائب صدر بھی ہیں۔
آیئے دردمند دل رکھنے والی گائنا کالوجسٹ، مصنفہ اور ناول نگار ڈاکٹر شگفتہ نقوی سے بات چیت کرتے ہیں۔

عام طور پر انٹرویو لینے والا اپنی مطلوبہ شخصیت سے وقت اور تاریخ لیتا ہے۔ دو تین بار کبھی کبھی اس سے زیادہ فون کرنے پر یہ دن اور ٹائم طے پا جاتا ہے۔ اور مقررہ وقت پر دونوں ایک مخصوص ماحول میں آمنے سامنے بیٹھ کر یہ خوشگوار فریضہ انجام دیتے ہیں۔

لیکن آج کی یہ ملاقات یا انٹرویو..... بالکل ایک مختلف صورت حال پیش کر رہا ہے، میں حریم ادب میں شمولیت کیلئے سیالکوٹ سے لاہور آئی۔گل رعنا، بشریٰ ،آسیہ راشد اور میں نے یہ خوبصورت محفل اٹینڈ کی۔ دل کی کلی کھلی اور تقریباً ایک سال بعد تمام لکھاری بہنوں سے یہ ملاقات نصیب ہوئی۔ابھی یہ شوق اور خمار کا عالم سوا نیزے پر تھا کہ آسیہ ہمیں گھر لے آئی۔

بہت خوبصورت سجا سجایا کمرہ ٹھہرنے کو ملا۔گرما گرم لذیذ پاکستانی ذائقے والی خوش رنگ اور خوش ذائقہ چائے پلائی اور غائب ہو گئیں۔تھوڑی دیر بعد ایک سوالوں کی فہرست لے کر پلٹیں اور فرمانے لگیں کہ آپ کا انٹرویو کرنا ہے۔ یہ رہا قلم اور کاغذ.....سوال پڑھ کر جواب لکھتی جائیں۔

ہم نے بہت ٹال مٹول کی کہ ابھی تو کتنے سینئر باقی ہیں۔ ہم تو اس فہرست میں آ ہی نہیں سکتے۔لیکن نہ جناب اس کمرے سے رہائی کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ انٹرویو لکھ دیں۔

س۔اپنا نام اور تاریخ پیدائش بتائیں؟

ج۔نام تو آپ کو علم ہے ویسے بھی نام میں کیا رکھا

ہے، گلاب کو جس نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔ میرا اصلی نام گھر والوں نے فاطمہ رکھا تھا۔ لیکن جب ہمیں لکھنے کا شوق چرایا تو ہماری ایک سہیلی نے ایک قلمی نام تجویز کیا کہ لکھنے والے عموماً قلمی نام رکھتے ہیں۔ یہ نام بہت مناسب رہے گا۔ اس کا نام زبیدہ انجم تھا۔ پھر ہم بچھڑ گئے وہ نہ جانے کہاں ہوگی۔ جہاں بھی ہو اللہ اسے خوش رکھے اور اس کی بخشش فرمائے آمین۔

خاتون سے اس کی عمر اور مرد سے اس کی تنخواہ نہیں پوچھنی چاہیے۔ انگریزی کا محاورہ ہے کہ ایک عورت اتنی بڑی ہوتی ہے جتنی وہ دکھائی دیتی ہے اور ایک مرد کی عمر اتنی ہوتی ہے جتنی وہ محسوس کرتا ہے۔

ویسے تاریخ یکم جنوری ہے۔ لوگ نیو ائیر مناتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں میری سالگرہ منا رہے ہیں۔

س۔ اپنا خاندانی پس منظر بتائیں؟

ہمارے آباواجداد محمود غزنوی کے ساتھ غزنی سے آئے تھے۔ یہ عالم اور درویش لوگ تھے، جنہوں نے بعد میں صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ کو اپنا مسکن بنایا۔ ہمارے جدامجد سید مردان شاہ کا مزار موضع چھپراں میں ہے۔ انہوں نے ہزاروں لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا اور قرآن پاک کی تعلیم دی۔ بعد ازاں ہمارے دادا باہر چلے گئے۔ ان کی عمر انڈونیشیا اور جاوا سماٹرا میں گزری۔

س۔ آپ کا گھریلو ماحول کیسا تھا؟

ج۔ ابا جان بہت سخت تھے۔ ہمیں ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ لیکن گھر میں اخبار رسالے اور کتابیں ہمیشہ موجود رہیں۔ یہی ماحول میری ادبی وابستگی اور اردو سے محبت کا باعث بنا۔ سکول میں جب نئی کتابیں آتیں تو دوسری کلاس سے لے کر میں اردو کی ساری کتاب ایک دن میں پڑھ لیتی تھی۔ امی ہمیں رات کو قصص الانبیا بہت بڑی کتاب تھی وہ پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ رسالہ نور اور زیب النسا آیا کرتے تھے۔

میرے ماموں جان نے زیب النسا میں ایک مضمون لکھا۔ روئے زمین پر پہلا قتل یہ ہابیل اور قابیل کا واقعہ تھا۔ میں دوسری کلاس میں تھی، جب میں نے یہ پڑھا اور ماموں جان کا نام دیکھا تو میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی لکھوں اور میرا نام شائع ہو۔ امی جان نے اردو کا اور انگلش کا ایک قاعدہ پڑھا تھا۔ لیکن وہ بخوبی پڑھ لکھ لیتی تھیں۔ نانی جان نے چار نسلوں کو قرآن پاک ناظرہ پڑھایا۔

میں نے ان کو نماز قضا کرتے نہیں پایا۔ ان کی

عمر 104 سال تھی۔لیکن کبھی روزہ قضا نہیں کیا۔ کمال درجے کی صبر کرنے والی خاتون تھیں۔ سچ بولنا، رزق حلال کی اہمیت، سادگی اور صبر یہ چاروں اوصاف میں نے ان سے سیکھے۔

میں جب نیشنل ہسپتال فیصل آباد میں بطور گائنا کالوجسٹ جاب کررہی تھی تو وہ ہمیں ملنے آئیں۔ دس پندرہ دن گزر گئے۔ ایک دن انہوں نے خواب دیکھا اور ہمیں سنایا۔ کہ دو آدمی آئے تھے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کو لینے آئے ہیں لیکن میں نے کہا ابھی نہیں جاؤں گی، دو دن بعد جاؤں گی۔ میری بہن اقبال کہنے لگیں کہ یہ بزرگ نہیں یہ موت کے فرشتے تھے ان کو پنڈی گھر بھجوا دو۔ میرا بیٹا عرفان کہنے لگا نہیں ہم ان کو تین ماہ تک رکھیں گے پھر جانے دیں گے، بات آئی گئی ہوگئی ۔ٹھیک دو دن بعد اسی وقت ان کا انتقال ہوگیا۔ صبح کی نماز پڑھ کر تسبیح ہاتھ میں تھی اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

تب مجھے اقبال کے اس شعر کی سمجھ آئی۔ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

س۔ آپ کے کردار اور تربیت میں کس کا اثر زیادہ رہا، ماں کا یا باپ کا؟

ج۔ میری تربیت میں زیادہ ہاتھ میری نانی جان کا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں۔ میری استاد تھیں، میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے حلوا یا مٹھائی میرے لیے چھپا کر رکھتی تھیں جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا کہ سب نے اپنا حصہ کھالیا لیکن مجھے پھر مل گیا۔

ابا جان کو یہ تک معلوم نہ ہوتا کہ کونسا بچہ کس کلاس میں ہے۔ جس دن رزلٹ ہوتا ہم آکر بتاتے کہ ہم پاس ہوگئے ہیں اور فلاں کلاس میں چلے گئے ہیں۔ چند دن بعد وہ پھر بھول جاتے۔ امی جان بے حد عقلمند، سلیقہ شعار، کفایت شعار، صلہ رحمی کرنے والی تھیں۔ ہر مہمان کی پذیرائی کرنا اور ان کو کھانا کھلانا ان کا شعار تھا۔ انہوں نے جی جان سے اپنی ماں کی خدمت کی۔ نانی ان کو کہا کرتی تھیں۔ بی بی مریم تو جنت میں جائے اور تیرا کوئی حساب کتاب نہ ہو۔ آخری سالوں میں امی کسی کے گھر رات نہیں رکتی تھیں کہ میری ماں اکیلی ہے اگر ان کا انتقال ہوجائے اور میں پاس نہ ہوں پھر کیا ہوگا۔

لیکن جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ

گھر میں منتظر رہیں اور فرشتہ اجل انکو میرے گھر سے لے گیا۔

س۔اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں بتائیں ،کتنے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟

ج۔ہم چار بہنیں اور ایک بھائی تھا۔بڑی بہن نے صرف چار جماعتیں پڑھی تھیں لیکن وہ سب سے زیادہ ذہین تھیں۔آٹھویں کا حساب بھی فٹافٹ حل کرلیتیں۔سلائی کڑھائی،خانہ داری نہایت بہترین۔ان کی ایک زمیندار گھرانے میں شادی ہوئی۔ بقید حیات ہیں۔دوسری بہن کا 2008ء میں انتقال ہوگیا۔ان کے دو بیٹے ہیں اور بھارا کہو میں رہتے ہیں۔

تیسری بہن اقبال ہیں جو میرے پاس رہتی ہیں۔ انہوں نے ٹیچرز ٹریننگ لی اور بیس سال تک لڑکیوں کے سکول میں پڑھایا۔سخت گیر اور ایماندار استاد تھیں۔ان کا رزلٹ ہمیشہ سو فیصد رہا چنانچہ جو کلاس کسی کے قابو نہیں آتی تھی وہ ان کے حوالے کی جاتی۔ہیڈ مسٹریس سب سے زیادہ اعتماد ان پر کرتی تھیں۔ بی اے اور ایم اے ٹیچرز کو بھی امتحان کے ہال میں مقرر نہ کرتی۔صرف یہ اقبال فاطمہ کا اعزاز تھا کہ ان کی ایمانداری پر سب کو ناز تھا۔

کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔ سلائی کڑھائی اور بنائی میں ماہر.....میری ہمراز ،میری دمساز،میری غمگسار زندگی بھر رہیں۔انہوں نے میرے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔ پالا،پڑھایا،کھلایا پلایا اور ہر دکھ درد میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔اللہ سے دعا ہے کہ انہیں ایمان کاملہ اور صحت کاملہ سے نوازے وہ میرے ساتھ آسٹریلیا میں رہتی ہیں۔

بھائی مجھ سے تین سال چھوٹا ہے۔اردو،انگلش، فارسی، ڈچ،عربی اور پنجابی زبانوں کا ماہر.....ایران میں ایرانیوں کو فارسی پڑھایا کرتا تھا۔اس نے زیادہ انگریزی اخبار میں کالم لکھے اور شاعری بھی کی۔

س۔ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی اور ایم بی بی ایس کہاں سے کیا؟

ج۔ابتدائی تعلیم مڈل سکول ٹیکسلا سے حاصل کی۔وہاں انگلش نہیں تھی۔اس کے بعد پنڈی سرداراں والا باغ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ایف اے اور بی اے پرائیویٹ کیا۔

س۔ دورانِ تعلیم کا ناقابل فراموش واقعہ بتائیں۔

ج۔ جب میں آٹھویں میں تھی تو ابا جان بہت

سخت بیمار ہوگئے۔ ہسپتال میں داخل تھے، انہیں شوگر تھی۔نوکر بھاگ گیا۔اب ہسپتال کھانا لے کر مجھے جانا تھا۔امی جان نے سکول چھڑوا دیا کہ تم ابھی چھوٹی ہو۔ اگلے سال پڑھ لینا۔ جب داخلے جانے لگے (آٹھویں کا امتحان بورڈ کا ہوتا تھا) تو میری خالہ زاد بہن میری ہیڈمسٹریس کے گھر کسی کام سے گئیں تو انہوں نے کہا کہ تمہاری بہن فاطمہ سکول نہیں آرہی۔اپنی خالہ سے کہو کہ اسے سکول بھیجوائیں۔کل داخلے جارہے ہیں۔ وہ وعدے کر کے آئیں اور امی سے بہت اصرار کیا۔امی مان گئیں لیکن سب نے کہا کہ دوماہ میں سارے سال کا کورس یہ کیسے پڑھے گی۔ دسمبر میں داخلے گئے فروری میں امتحان ہے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن سارا کورس ختم نہ ہوا۔امتحان ہوگئے۔ لیکن سب کی حیرت کی انتہانہ رہی جب میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگئی۔

ایک اور یادگار واقعہ ہے کہ میں آٹھویں میں تھی جب ہمارے گھر شمع ناول آیا۔اے آر خاتون کا ناول تھا۔ بڑی باجی نے وی پی منگوایا تھا۔اب وہ پڑھتیں اور دوسری بہنوں سے ڈسکس کرتیں۔میرا دل للچایا کہ میں بھی پڑھوں لیکن میرا تو ابھی ناول پڑھنا ہی ممنوع تھا۔ یا اللہ! اب کیسے پڑھوں۔رمضان تھا۔جب سب لوگ سو گئے تو میں نے باجی کے تکیے کے نیچے سے ناول نکالا اور کمرے میں لے گئی، گرمیاں تھیں۔ساری رات ناول پڑھا سحری کے قریب ختم کر کے دوبارہ وہاں رکھ دیا۔اس کے بعد سب لوگ سحری کرنے اٹھ گئے، میں بھی اٹھی، روزہ رکھا،سکول گئی کسی کو پتہ نہ چلا کہ میں ساری رات جاگی ہوں۔اب جب دونوں بہنیں ناول کی باتیں کرتیں تو میں دل میں ہنستی کہ مجھے تو سب پتہ ہے۔ بہت عرصے بعد بلکہ سالوں بعد میں نے انہیں بتایا کہ میں نے شمع ناول کیسے پڑھا تھا۔مجھے کتابیں پڑھنے کا بچپن سے ہی بے حد شوق تھا۔

س۔شادی کب اور کس سے ہوئی؟ شوہر اور سسرال کے بارے میں بتائیں؟

ج۔میٹرک کے بعد میری شادی ہوگئی۔ دو بچے ہوئے، میرے شوہر کو ایک بیماری میں غلط دوائی دینے سے ری ایکشن ہوگیا اور ان کے گردے فیل ہوگئے۔ اس طرح ان کا انتقال ہوگیا۔میری عمر بہت چھوٹی تھی وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑے تھے۔ میں نے پانچ سال جو شادی رہی اس کے دوران دیکھا سسرال والے سادہ، درویش، فراخ دل اور محبت کرنے والے

لوگ ہیں۔

س۔آپ کے میاں بحیثیت شوہر کیسے تھے؟

ج۔میرے میاں رحمان صاحب میں قوت برداشت بہت زیادہ تھی۔غصہ آتا تھا لیکن ضبط کر لیتے تھے۔کھانا کھانا چھوڑ دیتے تھے تو مجھے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ ناراض ہیں۔شادی کے بعد جب پہلی عید آئی تو سارے نوکر چھٹی پر چلے گئے۔میں نے کہا کہ اب کیا ہوگا مجھے تو روٹی پکانی نہیں آتی کہنے لگے کوئی بات نہیں آج دودھ جلیبیاں کھالیں گے۔روٹی تو روز ہی کھاتے ہیں۔ملازموں پر سختی کرتے تھے۔جب کسی نے چھٹی لینی ہوتی یا پیسے کی ضرورت ہوتی تو میرے پاس آ کر کہتے کہ ہماری سفارش کر دیں۔میری بات ہمیشہ مان لیتے تھے۔

س۔شوہر کی وفات کے صدمے کو کیسے سہا؟

ج۔شوہر کی وفات کے بعد میں نے میڈیکل میں داخلہ لینے کا سوچا میں نے میٹرک میں آرٹس کے مضامین پڑھے تھے اس کے باوجود مجھے ایف ایس سی میں داخلہ مل گیا یوں میں نے بہاولپور میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔

س۔کہاں جاب کی اور بچوں کے ساتھ گھر کیسے سنبھالا؟

ج۔زیادہ وقت ہسپتال میں گزرتا تھا لیکن بچوں کے پاس میری امی اور بہن اقبال ہوتے تھے۔بچے صبح سکول چلے جاتے اور میں شام میں فارغ ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی ایمرجنسی آ جاتی تو پھر جانا پڑتا تھا۔اکثر کھانے کے وقت بیٹی انتظار کرتی رہتی کہ امی آئیں گی تو کھانا کھاؤں گی میں آتی تو وہ سو چکی ہوتی میں جگا کر اسے ایک کیلا کھلاتی اور ایک گلاس دودھ پلا دیتی۔

س۔بچوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج۔بچوں میں بیٹی کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔میرا ہر مضمون افسانہ کتاب سب سے پہلے وہ پڑھتی ہے۔وہ ہی میری سب سے بڑی نقاد بھی ہے۔پہلے دور میں جو کچھ لکھا سو لکھا۔میڈیکل کالج میں آ کر صرف کالج میگزین تک محدود ہو گئے پھر گائنی کی بے پناہ مصروفیت میں وقت نہ نکال سکی۔میری بیٹی جب ذرا بڑی ہوئی تو کہنے لگی۔امی جان لوگ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں آپ لکھتی تھیں کہانیاں،مضمون اور افسانے وہ رسالے کہاں گئے۔میں نے کہا لوگ پڑھنے کے لئے لے گئے،واپس نہیں کیے۔پھر اس نے فرمائش کی کہ آپ لکھیں نا،میرے لیے لکھیں چنانچہ یہ دوبارہ لکھنا

میں نے اس کے لیے شروع کیا۔

دونوں بچے ڈاکٹر نہیں بنے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان پر اپنی رائے مسلط نہیں کی۔ ہر بچے کا اپنا انتخاب ہوتا ہے۔ ایف ایس سی دونوں نے کی لیکن اس زمانے میں میری جاب اتنی زیادہ محنت اور وقت طلب تھی کہ بیٹا کہنے لگا اتنی مشکل جاب مجھ سے نہ ہوگی کہ کال آتی ہے تو ہاتھ کا نوالہ منہ میں جانے کی بجائے واپس پلیٹ میں جاتا ہے۔ عید کے دن بھی ہم امی کی راہ ہی دیکھتے رہتے ہیں یہ بھی کوئی زندگی ہے اس سے تو اچھا کہ بندہ آلو چھولے کی ریڑھی لگا لے۔ اس پر سب خوب ہنسے۔ بیٹے عرفان علی نے آئی ٹی میں Monash یونیورسٹی میلبورن سے ماسٹرز کیا ہے اور وہاں ہی جاب کر رہا ہے۔ میں اس کے پاس میلبورن میں رہتی ہوں۔ بیٹی فاطمہ نقوی نے ایم اے بی ایڈ اور ایم بی اے کیا ہے اور آرمی پبلک سکول کی پرنسپل ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ بچے ٹیچرز اور سٹاف سبھی اس سے بہت خوش ہیں۔ اور پچھلے سات سال سے اس کا رزلٹ 100% ہوتا ہے۔

س۔ بچپن کا کوئی یادگار واقعہ سنائیں؟

ج۔ میری عمر شاید 6 سال تھی۔ ہمارا ایک نیا گھر بنا۔ وہ ایک ڈھلوان پر تھا۔ برآمدے کی کھڑکیوں میں ابھی جالی یا لوہے کا راڈ لگنا باقی تھے۔ نیچے شہتوت کے درخت تھے جن کی شاخیں کھڑکیوں تک آ رہی تھی۔ شہتوت سفید موٹے موٹے رس بھرے لگے ہوتے تھے۔ درختوں کے ساتھ ہی دو تہ خانے تھے۔ اس زمانے میں ہم گرمیاں وہاں گزارتے تھے۔ سب لوگ نیچے تھے میں اوپر آئی۔ کھڑکی کھولی اور شہتوت کی شاخ کو آگے ہو کر پکڑنا چاہا تاکہ تازہ شہتوت توڑ کر کھا سکوں۔ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور کھڑکی سے نیچے گر پڑی۔ پاؤں پھسلتے ہی میرے منہ سے نکلا ہائے امی جی.....ایک چیخ تھی۔

میرے ماموں خدا انہیں جنت نصیب کرے، باہر نکل آئے اور دونوں ہاتھوں میں مجھے پکڑ لیا۔ کوئی چوٹ نہیں آئی لیکن میں خوف کے مارے بے ہوش ہوگئی۔ ایسے ان کا وقت پر آ کر تھام لینا ایک معجزے سے کم نہیں۔ زندگی تھی میرے مولا نے کوئی کام لینا تھا جو اس طرح بچا لیا۔

س۔ پہلی باقاعدہ تحریر کہاں چھپی؟

ج۔ 1969ء میں اردو ڈائجسٹ میں ایک مضمون شائع ہوا۔ ''شوہر کا خانہ خراب کیجیے'' رسالہ آیا، پڑھا

تو ہمیں بھی تاؤ آیا ہم نے جوابی مضمون لکھا'' بیوی کا خانہ خراب کیجیے'' وہ سب کو اتنا پسند آیا کہ چند دنوں بعد ہمیں 50 روپے کا انعامی چیک موصول ہوا۔ اس وقت میں آٹھویں کلاس میں تھی۔ ان 50 روپوں کی خوشی آج کے پچاس لاکھ سے زیادہ تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں یہ خاصی بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ سب سے بڑا شغل ہی مطالعہ ہوتا تھا۔ شاعری کے جراثیم دادا جان کی طرف سے ملے تھے۔

س۔ لکھنا کب شروع کیا۔ اب تک کیا کیا لکھا۔ شاعری سے شغف کب ہوا؟

ج۔ میں ساتویں کلاس میں تھی تو پنڈی سے ایک اخبار نکلتا تھا ''تعمیر نو'' اس میں بچوں کے صفحے کیلئے کہانی لکھی تو وہ شائع ہوگئی۔ وہ خوشی مجھے آج تک یاد ہے۔ میں اور میرا بھائی بچپن میں گرمیوں میں جب سارے دوپہر کو سوجاتے ، ہم چپکے سے اٹھ کر باہر آجاتے۔ ہمارے صحن میں ایک شہتوت کا درخت تھا۔ اس کے سائے میں بیٹھ کر میں کہانی بناتی اور بھائی لکھتا جاتا۔

اس کی تحریر بہت خوبصورت تھی۔ ایسے لگتا جیسے کسی کاتب نے لکھا ہے یا موتی پروئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اس طرح ایک کہانی لکھی جس کا تھا نام شہزادی گلشن.....لیکن اسے شائع نہیں کروایا۔

اس کے بعد پیام اور چلمن میں لکھا۔ باقاعدگی سے ایک رسالہ ''حرم'' میکلوڈ روڈ لاہور سے نکلتا تھا۔ اس کی ایڈیٹر ظہیرہ بدر تھیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ انہوں نے لکھنے والوں کو ایک خاندان کی طرح لڑی میں پرو رکھا تھا۔ ان میں شبانہ یونس، شفیق تبسم (مرحوم) خالد محمود، جمیلہ ہاشمی، قمر سلطانہ، عاصم صحرائی، قیوم نظر، نظر زیدی، نثار بزمی لکھتے تھے۔ اب یہی نام یاد رہ گئے ہیں۔

کالج میں میگزین کی ایڈیٹر رہی۔ افسانہ، مضمون اور مزاح بھی لکھا۔ شاعری بھی کی۔ پانچ سال میڈیکل کالج کے سالانہ مشاعروں میں حصہ لیا اور ہمیشہ پہلا انعام حاصل کیا۔ آخر میں ٹرافی بھی جیتی۔

گرلز کالج میں جب ایف ایس سی کر رہی تھی تو ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا جو یاد رہ گیا ہے۔ ؎

جی چاہتا ہے کر سکوں وہ کارِ بے بہا
سب پوچھتے پھریں کہ یہ لڑکی کہاں کی ہے

ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگراموں میں بھی حصہ لیا وہ الفاظ کی ادائیگی اور پڑھنے کا طریقہ سکھاتے

تھے۔میری شاعری آمد ہے آورد نہیں۔ میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ یہ آدھی رات کو آنکھ کھل جائے اور کوئی شعر ہو جائے تو کہتا ہے اٹھو اور مجھے لکھو۔

جو واقعہ میرے سامنے گزر جائے۔اس کو نظم کر لینا اچھا لگتا ہے۔انداز عموماً مزاحیہ ہوتا ہے۔شاید میرے نام کا اثر ہے۔ مجھے خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا پُر امید رہنا اچھا لگتا ہے۔میری تمام کہانیوں کے انجام آپ دیکھ لیں کبھی مایوسی، افسردگی اور ڈپریشن والے نہیں ہونگے۔زندگی اللہ کی امانت ہے۔

س۔اب تک کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں؟

ج۔کتابوں کا سلسلہ 1996ء سے شروع ہوا۔سکون دل حصہ اول، دوم ،سوم، چہارم۔یہ چھوٹی چھوٹی کارآمد باتیں ہیں جو وقتاً فوقتاً میں نے اپنے مخاطب یا مریضوں سے کیں جو بات اچھی لگی میں نے لکھ دی۔حصہ اول کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ دو کتابیں ہیں ''نور ہدایت'' یہ قرآن پاک کی آیات محکمات کا اردو ترجمہ ہے۔دوسری ''نور بصیرت'' یہ ایک ہی موضوع پر نازل ہونیوالی آیات کا موضوعاتی انتخاب ہے اس پہ مجھے چار سال لگے اور چھ تفسیروں سے مدد لی۔

ان کے لکھنے کی ابتدا ایسے ہوئی کہ میں بیمار تھی اور آسٹریلیا میں تھی کام کوئی نہ تھا۔فارغ رہنے کی عادت نہ تھی۔رمضان تھا۔ میں نے سحری کے وقت رو کر اللہ پاک سے جھگڑا کیا کہ تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے میں کیا کروں۔تو وہ کام بھی بتا دے جو مجھے یہاں کرنا ہے۔ صبح اٹھی تو میرے دل میں یہ خیال موجود تھا کہ مجھے آیات محکمات کا اردو ترجمہ کرنا ہے۔یہ میری فریاد کا جواب تھا۔

؎افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

اس کے بعد زندہ کہانیاں لکھیں۔25 سال مسیحائی کے دوران کئی کردار ایسے ملے جو دل پر نقش چھوڑ گئے۔ یہ انہی کی داستانیں ہیں۔پھر ''یہ جہاں ہے آشیانہ'' یہ چودہ ملکوں کے سفرنامے ہیں۔ نیا ایڈیشن آ گیا۔بچوں نے گلہ کیا کہ ہمارے لیے کیوں نہیں لکھا۔ان کے لیے ایک ناول ''قاسم کی واپسی'' لکھا۔معاشرے کی چھوٹی چھوٹی برائیوں کے سدباب کیلئے افسانوں کی صورت میں ''حدیث دل'' لکھی۔2005ء کے زلزلے کے سلسلے میں کام کرنے تین دفعہ کشمیر گئی وہاں جو کچھ دیکھا اسے ''قیامت صغریٰ'' کے نام سے محفوظ کر دیا۔''بہشت کا راستہ'' میرا پہلا باقاعدہ ناول ہے۔اس پر چار سال

لگے۔ یہ میری تمام معاشرتی زندگی کا نچوڑ ہے۔میاں بیوی کے خوبصورت رشتے کی رنگینی کو برقرار رکھنے کیلئے ''خواب منزل،تحفہِ عروسِ نو'' لکھی۔ یہ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے جس کے غالباً چار ایڈیشن نکل چکے ہیں لوگ شادیوں پہ نئے جوڑے کو بطور تحفہ دیتے ہیں۔لیکن پرانے جوڑے بھی اسے چپکے چپکے پڑھ لیتے ہیں۔

پہلے ایسی ساری کتابیں مردوں نے لکھی تھیں تو خواتین کے حقوق واضح نہ تھے۔ بطور ڈاکٹر مجھے ان باتوں کا پتہ چلا جن کی اصلاح ضروری تھی۔ چنانچہ میں نے بارش کا پہلا قطرہ بن کر ان کی نشان دہی کی۔ جسے ہر طبقہِ خیال نے پسند کیا۔

باقاعدگی سے عفت،بتول،خواتین میگزین،نوائے سحر، اذان سحر، حجاب، سہیلی،نوائے آسٹریلیا، پاک آواز میں لکھتی رہتی ہوں۔ کچھ عرصے سے بچوں کے خطوں کے جواب اور جواب حاضر ہے کالم شروع کیا ہے۔اس سے اندازہ ہوا کہ ہماری نئی نسل کس قدر تنہائی کا شکار ہے۔ والدین کیلئے اور مصروفیات زیادہ ہیں۔ انہوں نے بچوں کو سکول اور ٹیکنالوجی کے حوالے کر کے اطمینان حاصل کر لیا کہ یہ دونوں ان کی بہترین تربیت اور دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں کر سکتے۔

اس سے بچوں میں قوت فیصلہ کی کمی اور عدم تحفظ کے احساسات جنم لے رہے ہیں۔خاندان کا جو تار و پود پچاس سال بلکہ تیس سال قبل تھا اب نہیں رہا۔

س۔ادب کی کون سی صنف شاعری، افسانہ نگاری،مضمون نگاری سے زیادہ لگاؤ ہے؟ آپ کس صنف میں اپنے خیالات کو آسانی سے بیان کر سکتی ہیں؟

ج۔شاعری سب سے زیادہ مؤثر ہے اور ہر شخص کو کم یا زیادہ ہر عمر میں اپیل کرتی ہے۔لیکن میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ نہ اس پر محنت کی۔ میری شاعری خود رو پودے کی طرح ہے۔ اس کی کانٹ چھانٹ کی جاتی، کھاد ملتی، داد اور اصلاح کا پانی ملتا تو شاید اس کی صورت مختلف ہوتی۔ مجھے اپنے خیالات کو بیان کرنے کیلئے نثر اور اس میں افسانہ زیادہ آسان لگتا ہے۔افسانہ بھی ایک کہانی کی طرح ہے اور کہانی ابتدائے آفرینش سے انسان کی کمزوری ہے۔اس طرح آپ اپنا پیغام،خیالات،سوچ اپنے افسانے کے کرداروں کے ذریعے دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ

بہت اثر ونفوذ والا میڈیم ہے۔ افسانے کا پلاٹ اس کے جاندار کردار، ماحول اور کسی حد تک ڈرامہ اسے دل چسپ بناتا ہے۔ پھر انجام قاری کے ذہن پر اپنی چھاپ ثبت کر دیتا ہے۔ مضمون بھی بہترین ہے لیکن وہ خشک ہوکر قاری کو بور اور بدمزہ کرسکتا ہے۔ ہر پڑھنے والے کا مزاج مختلف ہوتا ہے، اگر چار سطریں پڑھ کر مزہ نہ آیا تو اگلا صفحہ الٹ دیا۔ مضمون نہایت ہی نفیس اور نفسِ مضمون اعلیٰ ہوتو قاری کی توجہ اور وقت کو زنجیر ڈال سکتا ہے۔

س۔ آپ کی تحریروں پر کس لکھاری کی چھاپ ہے؟

ج۔ میرا خیال ہے میں نثر میں کسی سے متاثر نہیں ہوں۔ نہ ہی کسی کی گہری چھاپ ہے۔ میرا طرز تحریر سادہ ہے اس میں شوکتِ الفاظ کا گزر نہیں ہے جو چیز اس کو خوشگوار بناتی ہے وہ سچائی، طرز بیاں، اثر پذیری کی قوت اور تجسس ہے کہ آگے کیا ہوگا، کیا ہونے والا ہے۔ اس طرح میں اپنے قاری کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتی، وہ میری انگلی تھامے میرے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ یہ بات آپ کو میرے سفرناموں میں بھی ملے گی۔ ہمارا دور اردو ادب کا سنہرا دور تھا جو ہمیں نصیب ہوا۔ اس میں بہت تنوع ہے۔ آپ کسی ایک ادیب ،شاعر یا مصنف کو لیبل نہیں لگا سکتے۔ اردو ادب کی اس کہکشاں میں ایک سے ایک تابندہ ستارہ ہماری راہوں کو منور کر رہا ہے۔ یہی ہمارا اثاثہ ہے۔ آپ ہر ادیب کی کسی نہ کسی خوبی کے معترف ہوتے ہیں اس سے سیکھتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔

س۔ آپ کس ادیب کو بلند مقام پر دیکھتی ہیں؟

ج۔ شاعروں میں علامہ اقبال ہماری قوم اور اردو کیلئے فخر کا مقام ہیں۔ ایک کہکشاں ہے کس کس کا نام لیا جائے۔ فہرست طویل ہوجائے گی۔

س۔ آپ کی پسندیدہ شخصیت کون سی ہے اور بہترین کتاب آپ کسے سمجھتی ہیں؟

ج۔ پسندیدہ شخصیت علامہ اقبال اور کتاب قرآن پاک۔ آپ اسے جوں جوں پڑھتے اور غور وفکر کرتے ہیں وہ ہر دفعہ نئے معانی کے جہاں کھولتا جاتا ہے۔

س۔ نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام اور رہنمائی؟

ج۔ مطالعہ اور غور وفکر.....ہم نے معلومات اور ٹی وی شوز کو مطالعے کا نعم البدل سمجھ لیا ہے۔ یہ طرزِ عمل

درست نہیں۔ کتاب کا اپنا مقام ہے۔ اپنے دل کو ہر تعصب سے پاک کر کے سب مصنفوں کو پڑھیں اس سے بالغ نظری اور قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب سے بڑی قوت ہے یعنی صبر۔ اس سے عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ قلم تب رواں ہوتا ہے جب دل کبروغرور سے پاک ہو۔ تکبر تو صرف اس ذات باری کو زیبا ہے ہم تو محض ایک مٹھی خاک:۔

ہو جائے گا مٹی میں مل کر یہ بدن مٹی
یہ سبزہ و گل مٹی یہ سرو و سمن مٹی
جس چاند سے ماتھے پر جھومر بھی ہے بندیا بھی
یہ زلف و جبیں مٹی یہ غنچہ دہن مٹی

س۔ افسانہ نگاری کیلئے کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے؟

ج۔ مطالعہ اور مشاہدہ بہت ضروری ہے، اس کے بغیر اچھا افسانہ تخلیق نہیں ہوسکتا۔ علم اور ذخیرہ الفاظ ضروری ہیں۔

س۔ بہترین تحریر کب وجود میں آتی ہے؟

ج۔ جب آپ کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں تو شاید سو میں سے ایک تحریر کے وقت آپ کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی چیز لکھی جارہی ہے۔ وہ براہ راست رب کریم کا عطیہ ہے۔ باقی شاعری کی طرح نثر میں بھی آمد اور آورد موجود ہے۔ آپ کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں جب دیکھتے ہیں تو کچھ اور لکھا گیا، جو آپ نے سوچا تھا اس کے بالکل برعکس..... یہ کہاں سے آیا، کس نے لکھوایا.....بس یہ ایک صوفیانہ راز ہے اسے پردے ہی میں رہنے دیں۔

س۔ آپ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین سوشل ورکر بھی ہیں۔ آپ کے افسانوں میں اس کی واضح جھلک ملتی ہے۔ یہ آپ ارادتاً کرتی ہیں یا آپ کی شخصیت اور عادات کا حصہ ہے؟ اس سلسلے میں کوئی ناقابل فراموش واقعہ بھی بتائیں؟

ج۔ جسے آپ سوشل ورک کہتی ہیں یہ ہر انسان بلکہ بالخصوص مسلمان کے اخلاق کا حصہ ہے کہ آپ کا دل ہر وقت دوسروں کے خیال اور خدمت سے معمور رہے۔ یہ سچائی کا علم میرے مولا کی اتنی بڑی عطا ہے کہ میں کہاں اور یہ عظیم مقام کہاں.....ابتدا میں میں شکر ادا کرنے کیلئے یہ سب کچھ شعوری طور پر کرتی تھی پھر رفتہ رفتہ یہ میرے مزاج اور شخصیت کا حصہ بلکہ عادت بن گئی۔

میں ایک ٹرسٹ ہسپتال فیصل آباد میں جاب کررہی تھی میرے ساتھ چار جونیئر ڈاکٹر بھی ہوتی تھیں۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ آپ سے کوئی غلطی ہوجائے خدانہ کرے کسی کی موت بھی واقع ہوجائے تو مجھے آکر سچ بتادیں۔ میں آپ پرآنچ نہیں آنے دوں گی۔اپنے سر پر لے لونگی،صرف حقیقت بتا دیں۔

میری ایک ڈاکٹر ڈلیوری کرکے میرے پاس آئیں اور بتایا کہ میں ٹانکے لگارہی تھی کہ سوئی ٹوٹ گئی۔ بہت تلاش کیا لیکن آدھا ٹکڑا نہیں ملا۔ میں نے دوسری سوئی سے ٹانکے مکمل کرکے مریض کو کمرے میں شفٹ کروادیا ہے، نہ جانے وہ سوئی کہاں گئی۔ میں نے کہا فکر نہ کریں مل جائیگی۔ آپ نے سچ بولا بہت شکریہ۔ رات کا وقت تھا۔ دوسرے دن میں نے مریض کاایکسرے کروایا۔سوئی اندر ہی تھی نظر آ گئی۔

میں نے مریضہ سے کہا میں نے ذرا آپ کا معائنہ کرنا ہے۔آپریشن تھیٹر میں آئیں اور انجکشن لگا کرانہیں سلا دیا۔ سارا زخم دوبارہ کھولا۔ سوئی مل گئی اسے نکال کر دوبارہ سٹچ کردیااور انہیں کمرے میں شفٹ کروادیا۔اس طرح مریضہ کو پتہ بھی نہیں چلا اور ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔شکوہ شکایت یالڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آئی۔حکمت سے کام لیا جائے تو بہت سے کام اور مسئلے احسن طریقے سے انجام پاسکتے ہیں۔

س۔آپ اب تک دنیا کے کتنے ممالک میں جاچکی ہیں؟کس خطے کے لوگوں نے سب زیادہ متاثر کیا؟

ج۔دنیا کے سولہ ملکوں میں جاچکی ہوں۔ یورپ کے تمام ملک دیکھے ہیں ایک جیسے لگتے ہیں۔سڑکیں، شاپنگ سنٹر، قطار بنانا، سیل لگانا، بڑے بڑے سٹورز، ہر شخص مصروف، دوسرے سے بے پرواااور ایک بھاگ دوڑ کا منظر، آپ نے ایک ملک دیکھ لیا تو سارا یورپ دیکھ لیا۔ البتہ ایشیاء اورا فریقہ میں یہ یکسانیت نہیں ہے۔مسلمان جہاں بھی ہیں مغربی کلچر وہاں پہنچ گیا ہے۔ ترکی میں ایک میڈیکل کالج کے گیٹ پر تین طالبات سے ملاقات ہوئی۔ایک ڈینٹل کالج کی طالبہ دومیڈیسن کی تھیں۔ میں نے پہلاسوال کیا کہ تعلیم کس زبان میں ہے؟بولیں:ٹرکش زبان میں۔ میں نے کہا:جب پوسٹ گریجویشن کیلئے باہر جاتے ہیں توانگلش کے بغیر کیسے کام چلتاہے؟جواب ملا:سارے طالب علم تونہیں جاتے جو چند ایک جاتے ہیں وہ

فرانس جاتے ہیں اور تین ماہ میں فرنچ سیکھ لیتے ہیں۔ اب انکے لئے سب کو انگریزی پڑھانا تو سراسر زیادتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم ترکی میں حاصل کی جارہی ہے۔ مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کاش ہم بھی ایسے ہوتے ،میرا اگلا سوال تھا: یہاں حجاب کا کیا عالم ہے یہ 2000ء کی بات ہے وہ مسکرائی اور بولی ہم تینوں کو دیکھ لیں۔ فاطمہ حجاب میں تھی، ایمن جبیں پینٹ اور ٹاپ میں تھی،سلومی سلیولیس اور پینٹ میں تھی۔ بال کھلے لہرا رہے تھے ، مجھے سمجھ آ گئی۔ سری لنکا میں لوگوں میں عاجزی دیکھی۔ ایران میں سادگی اور مہمان نوازی دیکھی۔

س۔آپ کا انٹرنیٹ پر بے شمار لوگوں سے رابطہ ہے۔کیا آپ سمجھتی ہیں لوگ انٹرنیٹ پر آپ کی تھیراپی سے مطمئن ہوجاتے ہیں؟

ج۔انٹرنیٹ اس دور کی بے مثال ایجاد ہے،اس نے فاصلے مٹا دیئے ہیں۔آپ چند سیکنڈز کے اندر اندر دنیا کے کسی کونے میں رابطہ کر سکتے ہیں اور اپنا خط ارسال کر سکتے ہیں تمام دنیا اس کے ذریعے جڑ گئی ہے۔ چونکہ یہ رابطہ جلدی ہوجاتا ہے۔ اس لیے گھر بیٹھے خواتین اپنا مسئلہ بیان کر کے مطمئن ہوجاتی ہیں۔ میں ہر خط کا خود جواب دیتی ہوں۔اس میں مختلف قسم کے مسائل ہوتے ہیں۔ بیماریوں کے علاوہ میاں بیوی کے جھگڑے، بچوں کے معاملات،لڑکیوں کا کسی مصیبت میں پھنس جانا، پسند کی شادی،طلاق کے فیصلے سے پہلے مشورہ،آپریشن سے پہلے کسی دوسرے ڈاکٹر کی تائید وتصدیق، رپورٹیں بھی آجاتی ہیں۔اکثر لوگ فیضیاب ہوتے ہیں۔شکریے کی ای میل آتی ہیں۔انہی میں سے چند خطوط کا انتخاب کر کے میں جواب حاضر ہے کا لم ترتیب دیتی ہوں۔ رسالے میں اپنا جواب پڑھنے کیلئے اب کون انتظار کرے۔پھر جن کی رازداری مقصود ہوتی ہے وہ منع کر دیتے ہیں کہ ان کے سوال اور اس کا جواب شائع نہ کیا جائے۔لوگ آج کل پریشان ہیں انفارمیشن، ٹیکنالوجی، سائنس، سہولتیں، اعلیٰ تعلیم.....جتنی عام ہوگئی ہیں اتنی ہی زندگی پیچیدہ ہوگئی ہے۔ڈپریشن،ٹینشن،ان دیکھے خوف اور ذہنی الجھنیں بڑھ گئی ہیں۔انسان اکیلا ہوگیا ہے۔ایک چھت تلے رہنے والے بھی ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے ہیں۔

گلے شکوے، ناراضگی،توقعات.....ان سب نے انسان کا سکون چھین لیا ہے۔ اگر کوئی آپ کی پوری

بات سن کر مشورہ دے دے، توجہ دے، تسلی دے تو یہ بھی سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پتہ چلتا ہے کہ یقیناً لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔

س۔ زندگی کا سب سے خوشی کا لمحہ کون سا تھا؟

ج۔ بہت سے خوشی کے لمحات زندگی میں آئے۔ جب پہلی دفعہ خانہ کعبہ کو دیکھا تو وہ خوشی آج بھی یاد ہے۔ جب میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تو خوشی قابل دید تھی کیونکہ اس زمانے میں میرٹ بہت ہائی ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب بیٹی پیدا ہوئی تو بہت خوشی ہوئی کہ میری دوست آ گئی۔ مجھے بیٹیاں اچھی لگتی ہیں۔

اس کے بعد جب کوئی مشکل آپریشن کامیاب ہوا، خاص طور پر جسے دوسرے ڈاکٹروں نے انکار کر دیا ہو تو ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔

اب بھی کسی کا مسئلہ حل کر کے، اس کی خدمت کر کے، اس کی مدد کر کے بلکہ کھانا کھلا کر دلجوئی کر کے، مشورہ دے کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔

س۔ زندگی کا سب سے دکھی لمحہ؟

ج۔ دکھ کا لمحہ وہ تھا جب امی جان کا انتقال ہوا۔ پھر جب میرے شوہر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ جب ڈھاکہ فال ہوا۔ اور ہماری 93 ہزار فوج قیدی بنالی گئی تو کئی دن تک میرے آنسو نہ تھمے۔ میری ایک مریضہ تھی۔ دوران حمل (یہ اس کا تیسرا بچہ تھا، پہلے دو بیٹے تھے) اس نے کہا کہ میرے شوہر کویت میں ہوتے ہیں اور میں اکیلی بچوں کی پرورش نہیں کر سکتی۔ پاکستان میں بھی بہت آپشن ہیں آپ لکھ کر دیں کہ وہ واپس آ جائیں میں نے لکھ دیا، وہ آ گئے۔ وہ بہت خوش تھی لیکن اس کے منہ سے نکلا کہ ڈاکٹر صاحبہ اس دفعہ میں نے نہیں بچنا۔ میں نے جواب دیا ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے، اللہ رحم کرے گا۔ جب اسے ہسپتال میں لایا گیا تو گھر میں ڈلیوری ہو چکی تھی۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی وفات ہوگئی۔ ہم کچھ نہ کر سکے۔ مجھے اس کے الفاظ یاد آئے۔ ایک گھنٹے کا بیٹا رہ گیا۔ مجھے یہ دکھ بھی کبھی نہیں بھولتا۔ اب امت مسلمہ کے زوال کا دکھ ایک مسلسل کرب ہے۔

س۔ لوگوں کا کون سا رویہ آپ کو دکھی کرتا ہے؟

ج۔ جب وہ منافقت کرتے ہیں۔ منہ پہ کچھ اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ منافقین کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے۔ ان میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ اپنے

بغض، حسد، لالچ یا خواہش کا برملا اظہار کر سکیں۔

س۔آپ نوجوان نسل کیلئے رول ماڈل کسے سمجھتی ہیں؟

ج۔ہمارے رول ماڈل ہیں حضرت امام حسینؓ خلوص، شجاعت، ایثار، جرات اور کلمہ حق کیلئے رہتی دنیا تک عظیم قربانی دے کر اسلام کو حیاتِ نو بخشنے والے اور قائداعظمؒ انکا کردار ہماری نئی نسل کیلئے مشعل راہ ہے۔

س۔بے لگام میڈیا کے دور میں نوجوان نسل کو کیسے بچائیں مشورہ دیں؟

ج۔ بہت مشکل سوال ہے۔ ہم سب لوگ اپنی اغراض کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گھر کے ماحول.....خاندان کا اتفاق، یک جہتی، صلہ رحمی اور استاد کا مشفقانہ اور ناصحانہ رویہ کس حد تک بند باندھ سکتا ہے۔

س۔ بتول سے پہلی بار تعارف کب ہوا۔ حریمِ ادب سے کب متعارف ہوئیں؟

ج۔جب محترمہ سلمٰی یاسمین نجمی اس کی ایڈیٹر تھیں۔وہ میری بہت اچھی دوست اور میری مریض بھی رہ چکی ہیں۔ انہی کی معرفت ہوا تھا۔ تاریخ یاد نہیں رہی۔حریم ادب کے بارے میں سب سے پہلے آپا جی رشیدہ قطب سے سنا تھا۔ پھر آپا ثریا اسما سے ذکر سنا۔ لیکن کبھی شمولیت کا موقع نہیں ملا۔ جب پردیس سے واپس آئی تو سب لکھاری بہنوں سے ملنے کو بہت جی چاہا۔ پہلی بار 2010ء پھر 2012ء اور اب 2013ء تین دفعہ شرکت کا موقع ملا۔ بہت مزہ آیا۔ لکھنے والے کی زبان سے سننے کا اپنا ایک چاؤ ہے۔ڈاکٹر فرات غضنفر بہت اچھی کمپیئر اور شاعرہ بھی ہیں اتنے طویل عرصے سے میزبانی کا اعلیٰ معیار ان کی ادب سے محبت اور انسانیت کی خدمت کی دلیل ہے۔

س۔آسٹریلیا کب گئیں اور وہاں کے معمولات اور مصروفیات بتائیں۔

ج۔میں پہلی دفعہ جون 1988ء میں گئی تھی۔ میرا بیٹا وہاں زیر تعلیم تھا۔ پھر تقریباً ہر سال ہی جانا ہوتا رہا۔ اس نے وہاں جاب کر لی اور وہاں ہی رہنا پسند کر لیا۔ مستقل رہنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے اپنے وطن سے بہت محبت ہے اور اس کو چھوڑنا گوارا نہ تھا لیکن جب اس نے کہا میں نے آپ کے لیے الگ گھر بنایا ہے آپ اب بھی نہیں آئیں گی تو اس جملے نے میرا فیصلہ بدل دیا۔ میں جنوری 2007ء میں گئی تھی۔ پہلے ہر دو سال

بعد آتی تھی اب ایک سال بعد آجاتی ہوں۔ وہاں ایک مسلم ویمن کونسل آف وکٹوریہ ہے میں اس کی نائب صدر ہوں یہ کونسل مسلم خواتین کو مدد اور رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ گھر، جاب، روزمرہ کے معاملات، حلال فوڈ، بچوں کے مسائل اور قانونی مشورے وغیرہ۔ وہاں ملازم نہیں ہوتے۔ لہٰذا گھر کا سارا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ خریداری، صفائی، کھانا پکانا اور برتن دھونا شروع میں مشکل لگا لیکن اب عادت ہوگئی ہے تو اچھا لگتا ہے اچھی خاصی ورزش ہے۔ خطوں کے جواب دینا، مضامین لکھنا، آنے والی کتاب کا مسودہ، ہر ماہ ایک بزم ادب سجانا، فون پر مشورے دینا، مریضوں کو وہاں کے سسٹم کے بارے میں انفارم رکھنا، اسلامک لیکچرز وغیرہ اٹینڈ کرنا۔ پاکستان میں روزانہ کے معمولات یہ ہیں کہ صبح نماز اور تلاوت کے بعد سیر کرتی ہوں ایک گھنٹہ..... پھر کمپیوٹر پر خطوں کے جواب دیتی ہوں۔ آج کل ایک ڈسپنسری میں تین گھنٹے کی جاب کرلی ہے شام میں فون آتے رہتے ہیں 5 سے 8 بجے تک۔ سارے پاکستان سے ہر طرح کے مسائل کیلئے بہنوں کو اجازت ہے، یہ بھی خدمت کا ایک سلسلہ ہے کہ فون نمبر ڈائل کیا اور مسئلے کا حل فوری دستیاب ہوگیا۔ رات کو میں جلدی سو جاتی ہوں تا کہ نیند پوری ہو اور صبح وقت پر آنکھ خود بخود کھل جائے۔

س۔ کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟

ج۔ میں خواتین کیلئے ایک گوشہ عافیت بنانا چاہتی تھی کہ جو بے سہارا، بیوہ، یتیم، طلاق یافتہ یا شوہر سے لڑ کر گھر چھوڑ آئی ہو۔ ان کیلئے ایک گھر ہو جہاں ہر قسم کی سہولت اور ضرورت میسر ہو۔ کافی کوشش کی، فنڈ بھی مہیا کیے ہسپتال کی دوسری منزل پر کچھ خواتین کو بھی رکھا۔ بعد میں ان کی صلح ہوگئی لیکن گھر نہ مل سکا۔ پھر میں آسٹریلیا چلی گئی تو یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے 25 سال میڈیکل پریکٹس کے دوران یہ دیکھا اور محسوس کیا کہ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ سسرال سے اگر نکلے تو اکثر میکے کا دروازہ بھی بند ملتا ہے۔ جب تک والدین زندہ ہوں تو میکہ ہوتا ہے پھر عورت بچوں کو لے کر کہاں جائے۔ کراچی میں جماعت اسلامی کا ایسا مرکز میں نے دیکھا تھا۔ سوچا فیصل آباد میں بھی ہونا چاہیے۔

بہت کچھ کرلیا میں نے مگر اک کام باقی ہے
کہ اشکوں سے لکھوں سجدے میں اس کا نام، باقی ہے

اللہ پاک کو جیسے یاد کرنے اور اس کی قدر کرنے کا حق ہے وہ نہ کرسکی۔ جس کا بہت افسوس ہے اپنی کوتاہی

پر..... پتہ نہیں اس کو راضی اور خوش کر سکی یا نہیں۔ بس اس کی مخلوق کو راضی کرنے میں لگی رہتی ہوں۔

س۔ آپ لڑکیوں کو کیا مشورہ دیں گی پڑھ لکھ کر جاب کریں یا گھر سنبھالیں؟

ج۔ پڑھی لکھی عورت جاب اور فیشن کی دوڑ میں شامل ہوگئی اور کم پڑھی لکھی بہت اچھی بھی ہیں لیکن احساس کمتری کا شکار بھی ہیں۔ دراصل ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ شیطان نے یہ غلط فہمی ڈال دی ہے کہ جو عورت جاب کرے وہ کامیاب ہے اور جو گھروں میں اولاد کی تربیت، بزرگوں کی خدمت اور خاندان کی دیکھ بھال کر رہی ہے وہ کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ جاب کرنا عورت پر فرض نہیں کیا گیا۔ اصل چیز آنے والی نسلوں کو انسان ،مسلمان بنانا ہے۔ گھر انسانیت ساز فیکٹری ہے۔ جب اچھے انسان اس فیکٹری سے بن کر نکلیں گے تو یہ ملک چلائیں گے۔

س۔ بتول کے قارئین کیلئے کوئی پیغام؟

ج۔ بتول ایک تحریک ،ایک جذبے اور ایک نصب العین کا نام ہے اور نئی نسل کی تربیت اور ادب کی آبیاری کا کام کر رہا ہے۔ اسے پڑھیں، اس میں لکھیں اور اپنے دوستوں کو پڑھائیں کیونکہ ابلیسی طاقتیں زور وشور سے اپنے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔ ہم نے ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ قلم اور کتاب ہمارا ہتھیار ہے۔ اس سے غافل نہ ہوں۔ یہ ہر دین کا شعور اور درد دل رکھنے والے کا پرچہ ہے، آپ کا پرچہ ہے۔ اس لیے اسے لوگوں تک پہنچایئے۔

س۔ سادہ طرزِ زندگی گزارنے کیلئے بحیثیت ڈاکٹر مشورہ دیں؟

ج۔ سادہ طرزِ زندگی قناعت، آسانی اور راحت سے عبارت ہے۔

آخر میں دو شعر ؎

کسی سے وفا کی توقع نہ رکھنا
کہ اس شے کا دنیا میں چرچا نہیں ہے
ہر اک شے کی قیمت لگاتی ہے دنیا
پر انساں سے کوئی سستا نہیں ہے

☆☆☆

فرحت طاہر

بقلم خود۔۔۔بقدم خود

اپنی تخلیق کو موضوع بحث بنتے دیکھنا ہر ایک کے لیے منفرد تجربہ ہوتا ہے۔کوئی خوش ہوتا ہے
اور شاید کسی کو تنقید بری بھی لگتی ہو! یہ ہی ادبی نشست کی روح ہے! ایک دلچسپ روداد

ستمبر کے آخری ہفتے میں جب شب و روز ہی نہیں موسم بھی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہو اور انسانی جسم معمولات زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں بوکھلایا ہوا ہو کسی نشست کا انعقاد کوئی منا سب فیصلہ نہیں ہوتا۔لیکن شاید آئندہ چند دنوں میں عید قربان کی سرگرمیاں شروع ہونے کی وجہ سے منتظمین نے یہ فیصلہ کیا ہو! اسے عید الاضحیٰ کے بعد تک مؤخر کر نے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، ایک سوچ آئی مگر چونکہ ہم نے کئی پروگراموں کو عید قربان پر قربان ہوتے دیکھا ہے اس لیے جو ہوا اور جب ہوا بہتر ہی تھا۔یہ ذکر ہے کراچی کے ضلع وسطی کی ادبی نشست کا..... جہاں ہمیں مہمان بن کر آنے کی دعوت دی گئی تھی۔مہمان سے زیادہ میزبان سمجھ لیں۔جی ہاں! ویمن رائٹرز فورم کا پروگرام جو تھا۔

سخت حبس زدہ موسم میں ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد قبا آ ڈیٹوریم پہنچے تو اکا دکا لوگ آئے ہوئے تھے۔ہم پروگرام کی طوالت کا سوچ کر دل ہی دل میں سہمے مگر شاباش ہے کہ پروگرام وقت کی پابندی کے ساتھ شروع ہو گیا۔اچھی روایات قائم کرنا ایک احسن اقدام ہے ! تلاوت کے فوراً بعد ہمارے ہاتھوں میں خیر مقدمی کلمات کے لئے مائیک پکڑا دیا گیا جبکہ ابھی سانسیں بھی نہ سنبھلی تھیں اور مہمانوں کی آمد کا سلسلہ تیزی سے جاری تھا۔چنانچہ ڈھنگ کی کوئی بات نہ ہو سکی ہاں البتہ یہ ہوا کہ کم افراد کو ہماری سمع خراشی سہنی پڑی۔اس کے بعد تحاریر سننے اور سنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔میزبان اناؤنسر بڑی مشاقی سے پابندی وقت کے ساتھ اپنا فریضہ ادا کر رہی تھیں

ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے اردگرد بیٹھی ہستیوں سے گفت و شند کریں مگر اسٹیج پر بیٹھنے میں قباحت یہ ہے کہ آپ سب کی نظروں میں ہوتے ہیں اور پھر مسئلہ یہ بھی

تھا کہ اناؤنسر تحریر کے اختتام ہوتے ہی کسی بھی مہمان کا نام لے کر اس پر تبصرہ کرنے کو کہہ دیتیں بالکل اس طرح جیسے کمرہ جماعت میں ٹیچر اچانک کسی بچے کا نام لے کر کوئی سوال کر دے! سر محفل بے عزتی ہونے کا خدشہ تھا لہذا اونگھنے کا کوئی موقع نہ تھا یہ اور بات ہے کہ تحریریں اتنی جاندار تھیں کہ سونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اوپر سے ورائٹی ! لگتا ہے ہر رنگ کے پھولوں کو جمع کر کے گلدستہ بنایا ہو! اس پر منتظمین کے چناؤ پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ایک افسوس بھی جڑا ہوا ہے کہ یہ نشست محض ایک ضلع تک کیوں محدود رہی ! اتنے اچھے پروگرام کو تو شہر کی سطح پر ہونا چاہیئے مگر خیر! یہ اور بات ہے کہ دیگر اضلاع کی نمائندگی مہمانوں کی صورت میں تقریب کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

ایک اور دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ شاید یہ سوچ کر کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی مہمان عین وقت پر معذرت کر لے مہمانوں کی لسٹ منتظمین کی طرف سے ذرا لمبی رکھی گئی تھی مگر سارے مہمانان بقدم خود موجود تھے جسکا ثبوت وسیع و عرض اسٹیج کی تنگ دامنی تھی جبکہ کئی قابل ہستیاں اسٹیج سے نیچے بھی موجود تھیں۔ ہاں مگر کچھ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی جن میں افشاں نوید ہیں ! وہ شہر سے باہر تھیں۔ اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کرنے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی مگر ان کی ایک قلمی اور ادبی حیثیت بھی ہے! سو یہاں کی غیر حاضری کی تلافی ممکن نہیں ! ایک قلم کار جو پچیس برسوں کا نچوڑ ہو اس کی موجودگی نئے تازہ دم قلم کاروں کے لیے کتنی حوصلہ افزا ہو سکتی تھی !!

دوسری شمیم فاطمہ بری طرح یاد آئیں اگر وہ اپنا کوئی انشائیہ پڑھ لیتیں تو محفل سج جاتی ! وہ شاید اپنی بیماری کے باعث نہ آ سکی تھیں ! فریحہ مبارک کے انشائیہ نے یہ کمی پوری کر دی۔ مہمانوں میں وہی واحد نہیں تھیں جنہوں نے اپنی نگارش پڑھی بلکہ انیسہ سلیم اور روبینہ فرید بھی ادبی نشست کی مناسبت سے اپنی تخلیقات لے کر آئی تھیں جو انہوں نے پڑھ کر داد وصول کی۔ خصوصاً روبینہ کی نظم 'سنا ہے غم میں طاقت ہے!' بہت ہٹ ہوئی اور سامعین اس کی کاپی مانگتے ہوئے پائے گئے۔ دیگر مہمانوں کی فہرست میں غزالہ عزیز، حمیرا قریشی، صائمہ افتخار اور مہر افشاں تھیں۔ اسٹیج کے دائیں ہاتھ پر داخلی دروازے کے ساتھ کرسیوں پر میزبانوں اور منتظمین کے مطمئن اور فخریہ چہرے تھے گویا محنت وصول ہوئی ! واقعی جتنا گڑ ڈالو اتنا ہی میٹھا ہوتا ہے ! ہفتوں کی

بھاگ دوڑ اور تھکان آج خوشی بکھیر رہی تھی چہروں پر! بائیں طرف ترتیب سے لگے بینر صاف لگ رہے تھے کہ بطور خاص اس تقریب کے لئے بنوائے گئے ہیں اور توجہ مبذول کرا رہے تھے لیکن ملٹی میڈیا اور سکرین کی کوئی سمجھ نہ آئی۔

یہ پروگرام صرف شرکاء کی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ واقعی ایک کامیاب پروگرام تھا۔ کسی تحریر کو اس کے تخلیق کار کی زبان سے سننے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لب و لہجے میں تحریر کا تحرک بننے والے تمام جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ درمیان میں تبصرے !یوں سمجھیں جیسے کسی ڈش پر خوبصورت ڈیکوریشن کی ہو! اپنی تخلیق کو موضوع بحث بنتے دیکھنا ہر ایک کے لیے منفرد تجربہ ہوتا ہے۔ کوئی خوش ہوتا ہے اور شاید کسی کو تنقید بری بھی لگتی ہو! یہ ہی ادبی نشست کی روح ہے! پچھلے دنوں ایک تبصرہ سننے کو ملا کہ.....ایک دوسرے کو اپنے مضمون پڑھاتی سناتی رہتی ہیں اور کیا ہوتا ہے ادبی نشست میں.....؟ اس بے ذوقی پر ہم مسکرا کر رہ گئے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ اتنا فضول مشغلہ ہے؟ اس کا جواب بھی ایک سوال ہے! اگر ہمیں اپنا معاشرہ خود تشکیل کرنے کا موقع ملا تو انسانی ذوق کی تسکین کیسے ہوگی؟

ثقافت کی ترویج کس ذریعے سے ہوگی؟؟

اس کا جواب ''عکس خیال'' کی صورت میں موجود تھا۔ جی ہاں ! مجلّہ خاص ! جس کی آج رونمائی تھی اور دلنشین انداز میں وہ اسٹیج کی زینت بنا ہوا تھا۔ اس کی اشاعت پر مدیرہ اور سرپرست سمیت پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے! واقعی سرپرستی اور تعاون کے بغیر کسی فن یا ہنر کی آبیاری ممکن نہیں! اور وہ مہمانوں کے ہاتھوں میں سجے خوشبودار گجرے اس احساس کا مظہر تھے کہ کتنی دلجوئی اور نزاکت کے ساتھ پروگرام ترتیب دیا گیا ہے! تمام مہمانوں کو دو دو تحفے دیے گئے۔ ایک رسماً اور دوسرا شاید حوصلہ افزائی کے لیے!

مہمانوں کی تواضع چائے کے ساتھ سموسوں اور کیک سے کی گئی جبکہ آڈیٹوریم کے حبس زدہ ماحول میں خوشگوار یت کے باوجود موسم کا تقاضا تھا

ہر ایک کے ہاتھوں میں ایک آئس لولی پکڑا دی جاتی ! پروگرام کے اختتام پر تمام قلمکار ایک دوسرے سے ملاقات کو ترجیح دے رہی تھیں اپنی اپنی چائے چھوڑ کر کہ چائے تو ٹھنڈی بھی چلے گی ایک دوسرے کو دیکھ کر تقویت تو کر لیں پھر یہ محفل سال سے پہلے تو ناممکن

ہے!

خوب سے خوب تر کی فکر چیزوں کو بہتر بناتی ہے اس کا ثبوت یہ کہ اس نشست کا معیار پچھلے سالوں سے یقیناً بلند ہوا ہے۔ توقع ہے کہ دیگر اضلاع بھی ایسی خوش کن تقریبات منعقد کرتے رہیں گے!!

☆☆☆

اُجڑا گھر

بڑھیا چاروں طرف حیرانی سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اُسے کسی کی تلاش ہے لوگوں سے راستہ معلوم کرتی ہوئی وہ چلی جارہی ہے کوئی اہم مسئلہ درپیش لگتا ہے لوگ اُس کی رہنمائی کررہے ہیں وہ جس سے پوچھتی ہے کہ بادشاہ کا گھر کدھر ہے؟ وہ اس کی آگے رہنمائی کردیتا ہے بڑھیا چلی جارہی ہے ذہن کے پردے پر بادشاہ کے محل کی تصویر بن رہی ہے۔ بہت بڑا محل، اونچی اونچی دیواریں، بہت بڑا آہنی دروازہ اور دروازے پر کھڑے باوردی اور مسلح پہرہ دار، ہیبت، خوف اور نجانے کیا کیا بوڑھے ذہن کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر کسی سے پوچھتی ہے ''ارے بھائی! بادشاہ کا محل ابھی کتنی دور ہے؟'' ''اماں یہ بالکل تمہارے سامنے'' کوئی ہاتھ سے اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

بڑھیا حیران وششدر کھڑی ہے نظروں سے بے یقینی ٹپک رہی ہے بادشاہ کے محل کی بنائی ہوئی تصویر کا کہیں نام ونشان نہیں ہے چھوٹی چھوٹی کچی دیواریں، بوسیدہ سا گھر، ٹوٹے کواڑ، ٹاٹ کا پردہ، کھلے دروازے، نہ دربان نہ نگران اور نہ ہٹو بچو کی صدا۔ ''اللہ یہ میں کہاں آگئی ہوں یہ بادشاہ کا محل نہیں ہوسکتا، کہیں غلط جگہ تو نہیں ہے''۔ وہ خود کلامی میں مبتلا ہے۔ ''چلو! اندر چل کر گھر والی سے پوچھتی ہوں' اسی شش وپنج میں وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو جاتی ہے۔ ایک نوجوان خوبصورت عورت پیوند لگے کپڑے پہنے گھر کے کام کاج میں مصروف ہے بڑھیا کو دیکھ کر استقبال کیلئے لپکتی ہے چہرے سے نقاہت عیاں ہے جیسے فاقے سے ہو۔ بڑھیا حیرانی سے گھر اور گھر والی کو دیکھ رہی ہے اسے یہ گھر ذرا اچھا نہیں لگ رہا۔ ''میں بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں کسی نے مجھے بتایا ہے کہ بادشاہ کا گھر یہی ہے'' وہ بے یقینی کے انداز میں عورت کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ''کیا یہ گھر بادشاہ کا ہے'' ذہن کسی طرح ماننے پر تیار نہیں ہے۔ ''ہاں اماں! تم ٹھیک جگہ پر آئی ہو۔ ''آؤ بیٹھو! وہ آنے والے ہی ہیں'' عورت کی آواز میں بڑی محبت اور مٹھاس ہے بڑھیا فوراً بیٹھ جاتی ہے۔ کھری کھاٹ بچھی

ہے ایک طرف پانی کا کٹورا رکھا ہے ایک کمرہ ہے۔ سارا گھر کچی اینٹ گارے کا ہے۔ سادہ اور خالی گھر۔ بڑھیا کی نظریں ماحول کا جائزہ لے رہی ہیں حیرانی بڑھتی جارہی ہے۔ گھر والی بڑی خندہ پیشانی سے پیش آرہی ہے بڑھیا باتوں ہی باتوں میں جان چکی ہے کہ یہ ملکہ عالیہ ہیں۔ اس کی باتیں بڑھیا کے دل میں اتر رہی ہیں ملکہ عالیہ سے اسے سگی بیٹی کی طرح محبت محسوس ہورہی ہے۔ اسی محبت میں وہ اچانک سوال کرتی ہے'' بیٹی یہ گھر اُجڑا اُجڑا سا کیوں لگتا ہے'' ''اماں! اس لئے کہ اس سے اُجڑے گھر بسائے جاتے ہیں'' ملکہ پر سکون لہجہ میں جواب دیتی ہے۔ دل و دماغ اس جواب سے مسحور ہوجاتے ہیں۔ بڑھیا بہت متاثر ہے اسی اثنا میں ایک مفلوک الحال مرد اندر آتا ہے اور صحن میں بنے کنویں میں سے پانی نکالنے لگ جاتا ہے ساتھ ساتھ وہ عورت کو بڑی چاہت سے دیکھ بھی رہا ہے۔ بڑھیا جس کے دل میں ملکہ کی محبت گھر کر چکی ہے نہایت غصہ سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے ''بیٹی یہ مرد کون ہے جو مڑ کر تمہیں دیکھ رہا ہے'' وہ عورت سے سوال کرتی ہے ''اماں ! یہ میرے شوہر ہیں خلیفتہ المسلمین'' عورت محبت سے جواب دیتی ہے بڑھیا کا سر فرطِ عقیدت و محبت سے جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے سارے مسئلے بھول چکی ہے پے در پے عجیب انکشافات حیرانی کے ساتھ ساتھ اُس کی محبت میں اضافہ کر رہے ہیں وہ جب اس گھر میں داخل ہوئی تھی تو اس کیلئے اس مکان اور مکینوں میں کوئی کشش نہ تھی اب اُن عمل و کردار کے زندہ نمونوں کو دیکھ کر اس گھر سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی شے عزیز نہیں رہی ہے۔

یہ گھر عمر بن عبدالعزیز کا ہے۔ وقت کے بادشاہ کا گھر۔ عورت ان کی بیوی فاطمہ ہیں۔ خاتون اوّل، ملکہ عالیہ فاطمہ۔

یہ وہ بادشاہ ہیں کہ خلافت کے وقت ان کے سامنے شاہی سواری پیش کی جاتی ہے۔ پوچھتے ہیں یہ کیا ہے بتایا جاتا ہے یہ شاہی سواری ہے اب تک بنو امیہ کے سب خلیفہ اس پر سواری کرتے رہے ہیں ناراضگی سے فرماتے ہیں'' اِسے لے جاؤ میرے لیے میرا خچر کافی ہے''۔

''اس کی پیٹھ پر بیٹھتے ہیں تو محافظ ساتھ ہو لیتے ہیں سب کو منع کرتے ہیں کہ کسی انسان پر لازم نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے لئے پابند کرے میری حفاظت کیلئے اللہ کافی ہے'' شاہی محل میں منتقلی کا کہا جاتا ہے تو

کہتے ہیں ''میری وہ کٹیا جہاں میں رہتا ہوں میرے اور میرے گھر والوں کیلئے کافی ہے''۔

یہ کل کے بادشاہِ وقت کی زندگی کا مکمل آئینہ ہے۔ ذاتی کردار، آرام وآسائش، سہولیات، مراعات، گھر بار ، اہل خانہ، مصروفیات، خوراک ، لباس اور اخلاق و معاملات کا اس کے ساتھ ساتھ عوام کی فلاح و بہبود، حقوق کی فراہمی اور عدل وانصاف کا۔

انہیں ملکہ عالیہ کا بیان ہے کہ اکثر ایسا ہوتا آپ گھر والوں کے ساتھ ہوتے کہ یکدم یوں الگ ہو جاتے جیسے کسی چیز نے کاٹ لیا ہو اور بے ہوش ہو جاتے۔ ہوش میں آتے تو پوچھا جاتا کہتے کیا میری حالت غیر ہونے کیلئے یہ بات کافی نہیں کہ جہاں تک میری حکومت ہے وہاں تک مجھ سے پوچھا جائیگا۔ ایک وہ حکمران تھے احساس ذمہ داری، جوابدہی سے مالا مال۔ جو دنیا میں کامیابی کیساتھ حکمرانی کر گئے۔ انہوں نے شان وشوکت کو پسند نہ کیا۔ ذاتی آرام وآسائش کو تج دیا۔ آخرت میں مقام ومرتبہ پانے کیلئے دنیا کی تنگی قبول کی اور تمام شاہی مراعات سے یکسر انکار کر دیا۔ جنہوں نے تمام اصلاحات کا آغاز اپنی ذات، گھر اور خاندان سے کیا۔ زندگی مشقت اور فاقوں میں گزار دی۔ سادگی کو وطیرہ بنایا۔ سنتِ رسول ﷺ کو اپنایا۔ دیکھنے والوں کو ان کی دنیا اور ان کے گھر تو اُجڑے اُجڑے نظر آئے لیکن ان اجڑے گھروں نے باقی تمام گھروں کو بسا دیا۔ تحفظ دیا۔ امن وسکون اور آسودگی دی۔ اور یوں اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کر کے اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقہ پر ادا کر کے اللہ کے ہاں سرخرو ہو گئے۔ ان کی آخرت سنور گئی۔

یہ آئینہ ہے آج کے حکمرانوں کیلئے۔ جنہوں نے اپنے اختیارات کو ذاتی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے۔ عوام کا خون چوس کر، اُنہیں حقوق سے محروم کر کے بڑے بڑے محل خریدے جا رہے ہیں۔ گھروں میں نوکروں کی فوجیں ہیں۔ محلوں کے آہنی گیٹ ہر وقت بند رہتے ہیں باوردی اور مسلح دربان ان پر قابض ہیں۔ لمبی لمبی گاڑیاں ، ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز ذاتی استعمال کیلئے ہیں۔ ملکی بیت المال ذاتی ملکیت بن چکا ہے۔ خوراک اور لباس کا لاکھوں کروڑوں تک پہنچ جاتا ہے۔ عوام کے بادشاہ عوام کے مسائل سے بے پرواہ ہیں۔ بادشاہِ وقت تک عام انسان کی رسائی بالکل ناممکن ہے۔ اپنے محل پہروں کے اندر ہیں۔ عوام کے گھر غیر محفوظ ہیں۔ چادر اور چار دیواری کے تحفظ سے

حکمران غافل ہیں چوریاں، ڈاکے، قتل و غارت ، عزتوں کی پامالی عروج پر ہے اور حکمران بانسری بجا رہے ہیں۔ لوگوں کے گھر اُجاڑ کر اپنے گھر سجائے اور بسائے جارہے ہیں نتیجتاً پاکستان اُجڑ رہا ہے۔ اسلام کا قلعہ کمزور پڑ رہا ہے۔

شائد آج کے حکمران اس بات کو بھول چکے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے یہ عیش وعشرت کا سامان چند روزہ ہے کھیل اور دل لگی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ اپنے سارے کارناموں کے ساتھ بادشاہِ حقیقی کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ذلت اور رسوائی ان کے چہروں پر چھا رہی ہوگی۔ کیا حال ہوگا اس وقت جب مالکِ کائنات اِن سب سے ایک ایک لمحہ کا حساب لے گا۔ کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اس دن تو اپنے رب کے حضور ہی کھڑے ہونا ہوگا۔ کتنے حق دار ہوں گے جو وہاں ان بادشاہوں کی طرف سے کی گئی حق تلفیوں کا حساب بادشاہِ حقیقی سے مانگ رہے ہوں گے۔ اور فیصلہ اس دن اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ دوسروں کی دنیا اُجاڑ کر اپنی دنیا بنانے والوں کی کل کی دنیا اجڑ جائیگی۔

قبل اس کے کہ وہ دن آئے مہلتِ عمل میں اپنا محاسبہ کرتے ہوئے آج کے حکمرانوں کو توبہ استغفار کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ تاریخ کے روشن نمونوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کل مظلوم، مجبور اور حقوق سے محروم عوام اللہ کی عدالت میں ان سے پورا پورا حساب لے کر رہیں گے اور یوم الحساب تو اب بھی بہت قریب ہے۔

☆☆☆

جب مجھے جونک چمٹ گئی

کچھ سال پہلے مجھے اپنی فیملی کے ساتھ لنکاوی (ملائیشیا) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہیں قریب ایک پکنک پوائنٹ سیون ویل (Seven wells) کے نام سے مشہور تھا لہٰذا ہم سب اسے دیکھنے چل دیئے۔ ایک بڑے پہاڑ کی چوٹی پر سات گڑھے تھے جو کنوؤں کے نام سے مشہور تھے۔ انکی خوبی یہ تھی کہ وہ کچھ اس ترتیب سے بنے ہوئے تھے کہ پہاڑ کی چوٹی سے بہنے والے آبشار کا پانی باری باری ان تمام سے گزرتا ہوا پہاڑ سے نیچے چلا جاتا۔ سرسبز و شاداب پہاڑ پر بہتا صاف وشفاف پانی جب ان کنوؤں سے بہتا ہوا گزرتا تو دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتا۔

ہم سب بھی انہی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے پاؤں پانی میں ڈالے پاس پڑے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ میرا بیٹا اور شوہر اس میں ہلکی پھلکی سوئمنگ کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا یہ آپ کے پاؤں پر کالی چیز کیا ہے؟ میں نے دیکھا تو وہ ایک کیڑا تھا میں گھبرا گئی اور اسے ہاتھ سے ہٹانے لگی مگر میری کوشش ناکام رہی۔ میرے شوہر نے دیکھ کر کہا یہ تو جونک (Leech) ہے۔ انہوں نے اسے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ بہت مضبوطی سے چمٹی ہوئی تھی اور اتر نہ رہی تھی۔ اسے ہاتھ سے پکڑنے سے مجھے کراہیت محسوس ہو رہی تھی اسی لمحے میرے شوہر نے ٹشو پیپر سے پکڑ کر اسے کھینچا اور دور پھینک دیا۔ ایک دم ہی اس جگہ سے خون تیزی سے بہنے لگا۔ میں نے زخم کو تھوڑی دیر دبا کر سنی پلاسٹ لگایا اور بے فکر ہوگئی مگر جلد ہی خون دوبارہ بہنے لگا اور ساتھ ہی مجھے اس پر خارش بھی ہونے لگی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پھر اس جگہ کو دبایا اور سنی پلاسٹ لگانے کو تھی کہ خون بہنے لگا۔ ہم سب ہی پریشان ہوگئے کہ اتنے معمولی زخم سے خون تیزی سے کیوں بہہ رہا ہے اور دبانے پر رک کیوں نہیں رہا۔ بہرحال کافی دیر دبانے کے بعد بالآخر خون نکلنا بند ہوگیا اور ہم نے سکھ کا سانس لیا لیکن میں جونک سے بہت ڈر گئی۔

پاکستان آنے کے بعد میں اس معمولی واقعے کو بالکل

بھول گئی۔لیکن آج ڈاکٹر ذاکر نائیک کی کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' کا یہ مضمون ''انسان ''علَقٍ'' (جونک جیسی شے) سے بنا ہے'' پڑھ کر بے اختیار مجھے وہ بات یاد آ گئی۔ڈاکٹر نائیک اس مضمون میں اس مشہور واقعے کا ذکر کرتے ہیں جب چند سال پہلے عرب کے کچھ سائنسدانوں نے جینیات کے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات اکٹھی کیں اوران کا انگریزی ترجمہ کر کے ڈاکٹر کیتھ مور (Keith Moore) کوتبصرے کے لئے بھجوائیں۔ڈاکٹر مور کینیڈا کی یونیورسٹی آف ٹورنٹو کے شعبہ تشریح الاعضاء کے چیئرمین اورجینیات کے پروفیسر ہیں۔وہ جینیات کی فیلڈ میں ایک اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ڈاکٹر مور نے ان آیات کا جائزہ لینے کے بعد انکشاف کیا کہ ''قرآن مجید میں جینیات کے بارے میں دی گئی زیادہ ترمعلومات اس میدان میں جدید دریافتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ان میں کہیں بھی تضاد نظر نہیں آتا۔'' (صفحہ ۲۷)اس کے ساتھ ہی چند ایسی آیات تھیں جن کے بارے میں ان کی اپنی معلومات محدود ہونے کے باعث وہ کوئی حتمی جواب نہ دے سکے انہی آیات میں سے ایک آیت یہ تھی۔''خَلَقَ الاِ نْسَانَ مِنْ علَقٍ۔ترجمہ:اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔(سورۃ العلق:٦) دراصل علَقٍ سے مراد ''جمے ہوئے خون کے لوتھڑے'' کے علاوہ ''جونک کی طرح چمٹنے والی'' چیز بھی ہے۔لہٰذا ڈاکٹر مور نے انتہائی طاقت ورخوردبین کے ذریعے جنین کی ابتدائی شکل کا مطالعہ کیا اور جونک سے اسکی مشابہت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔اس طرح قرآن کی آیات سے مزید معلومات حاصل کیں جو وہ اب تک دریافت نہ کر سکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ایک کتاب ''دی ڈیویلپنگ ہیومن'' (The developing human) لکھ چکے تھے لیکن قرآن سے عرفان پا کرانہوں نے ۱۹۸۲ میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن تحریر کیا اور یہ ایک ''بہترین کتاب کا ایوارڈ'' جیت چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب کو میڈیکل تعلیم میں جینیات کے شعبے میں نصاب کا حصہ بنادیا گیا۔۱۹۸۱ میں سعودی عرب (دمام) میں منعقدہ دوسری عالمی طبی کانفرنس میں ڈاکٹر مور نے انتہائی خوشی اوراطمینا ن سے اس بات کا اظہار کیا کہ قرآن مجید کی آیات کی تشریح سے ''مجھ پر یہ بات عیاں ہوئی ہے کہ محمد ﷺ کو علم وحکمت کی یہ باتیں ضرور اللہ ہی نے بتائی ہیں کیونکہ کئی صدیاں قبل تک بھی انہیں دریافت نہیں کیا

جاسکا تھا۔ مجھ پر یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔'' (صفحہ ۷۵) نجانے کتنے لوگ ڈاکٹر مور کی طرح اللہ کی معرفت پا گئے ہونگے۔ میں نے جونک کے چمٹنے کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اس واقعے پر کچھ غور وفکر کرتی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بارہا ہمیں اس بات کی تلقین کی ہے کہ ہم اس کی آیات (نشانیوں) پر غور کریں۔ اسی احساسِ شرمندگی کے تحت سوچا تھوڑی بہت ریسرچ کروں اور کم ازکم ان دوسوالات کے جوابات ضرور تلاش کروں جو اس وقت فوری طور پر میرے ذہن میں آئے تھے۔ پہلا سوال یہ کہ جب جونک نے مجھے کاٹا اور وہ میرا خون پیتی رہی تو مجھے درد کیوں نہیں محسوس ہوا؟ اور دوسرا یہ کہ اس معمولی سے زخم سے خون کیوں اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا اور دبانے کے باوجود رک نہیں رہا تھا؟ ان دونوں سوالوں کے جوابات وکی پیڈیا سے معلوم ہوئے جو کچھ اس طرح ہیں۔

دنیا بھر میں اب تک جونک کی ۷۰۰ اقسام معلوم ہوئی ہیں جن میں تقریباً ۵۰۰ اقسام صاف شفاف پانی میں رہتی ہیں۔ یہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر زندہ رہتی ہیں۔ ان کی چند ایک اقسام ہی انسانوں کا خون پسند کرتی ہیں۔

جونک کے لعاب میں ایسا مواد ہوتا ہے جو اس کے کاٹے کی جگہ کو سن کرنے (Anesthetic) کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب یہ کسی جگہ کاٹتی ہے تو درد چبھن کا احساس نہیں ہوتا اور یہ مزے سے خون چوسنے میں مصروف رہتی ہے البتہ بعد میں اس جگہ الرجی جیسی جلن اور سرخی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے کاٹنے سے دوسری بیماریاں پھیلنے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ جونک کے لعاب میں خون کو جمنے سے روکنے والے مواد بھی پائے جاتے ہیں جنہیں (anticoagulant) کہتے ہیں اسی وجہ سے اس کے کاٹے کی جگہ سے خون عام cut کی نسبتاً زیادہ دیر سے رکتا ہے۔ جونک کی انہی خوبیوں کی وجہ سے قدیم زمانے میں یونانی معالجین اسے بیماریوں میں استعمال کرتے تھے جہاں کسی جسمانی چوٹ کی وجہ سے خون کا بہاؤ رک جاتا تھا ۔بعد میں جدید طریقوں کے پیشِ نظر اس علاج کو ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۸۰ کے بعد پلاسٹک سرجری کی مقبولیت کے ساتھ ہی یورپ سمیت کچھ اور ممالک میں جونک کو دوبارہ ایسے مریضوں پر آزمایا گیا جن میں Venous congestion کی وجہ سے صاف خون لانے والی

شریانوں کے بند ہونے اور خون کی سپلائی رکنے کی وجہ سے اردگرد کے خلیوں کے مردہ ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے جسے(necrosis) کہا جاتا ہے۔ان مردہ خلیوں پر جب جونک خون چوسنا شروع کرتی ہے تو دراصل وہ دو اہم کام انجام دیتی ہے پہلا یہ کہ(suck) کرتے ہوئے وہ کچھ مردہ خلئے بھی کھینچتی ہے اور اسکے خون چوسنے کے عمل کی وجہ سے زخم کے اردگرد کی باریک نالیوں یا(capillaries) میں خون کا بہاؤ بڑھ جاتا ہے اور زخم مناسب انداز سے بھرنے لگتا ہے۔

آخر میں یہ کہ جونک کے چمٹنے میں ایک مشکل درپیش رہتی ہے کہ ایک دفعہ چمٹنے کے بعد اسے اتارنا مشکل ہوتا ہے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ ٹشو پیپر، کپڑا یا کاغذ کی مدد سے ہٹایا جائے۔ کچھ لوگ اسے ہٹانے کے لئے اس پر نمک، سرکہ یا لیموں کا رس ڈالتے ہیں جس یہ فوراً اپنی جگہ سے اتر جاتی ہے لیکن اسے خطرناک سمجھا جاتا ہے کہ ایسے میں زخم پر الٹی کر دیتی ہے اور اسکے معدے میں موجود کئی قسم کے جراثیم انسان کے جسم میں شامل ہوکر بیماری کا سبب بن سکتے ہیں لہٰذا اس سے پرہیز ضروری ہے۔

آخر میں ایک اہم بات کہ لٹریچر سرچ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حجامہ/ پچھنے لگوانا(Cupping Therapy) جو کہ ایک مسنون طریقہ علاج ہے اس میں بھی دراصل leech therapy کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔صحیح بخاری میں سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ رسول ﷺ نے فرمایا(ترجمہ)''شفا کے تین ذریعے ہیں، شہد کا استعمال، پچھنا اور داغ لگانا. Cauterize یعنی داغ دینے سے میں اپنی امت کو روکتا ہوں۔'' امام ابن قیم طب نبوی میں اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں آپ ﷺ نے''علاج بالحجامہ کا ذکر فرما کر فصد کے ذریعہ علاج کی راہ ہموار کر دی ہے۔''(صفحہ:٦٧) صحیحین میں ابن عباسؓ سے مروی ہے(ترجمہ)''نبی ﷺ نے پچھنا لگوایا اور حجام کو اس کی اجرت دی۔''اس کے علاوہ انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں''رسول ﷺ کو پچھنا ابوطیبہ نے لگایا۔آپ نے بطور اجرت دو صاع غلہ دیئے جانے کا حکم دیا اور اپنے غلاموں سے گفتگو فرمائی۔انہوں نے ابوطیبہ کا حصہ کم کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا جن چیزوں سے تم علاج کرتے ہو ان میں بہتر پچھنا لگا کر علاج کرنا ہے۔''ان احادیث سے حجامہ کی اہمیت وافادیت

ظاہر ہوتی ہے۔

حجامہ یا پچھنا لگوانا سے کیا مراد ہے؟ ڈاکٹر تیمور شعبان اپنے مضمون What is cupping therapy? میں لکھتے ہیں کہ یہ local congestion یا فاسد خون کو(cup(s کے ذریعے vacuum لگا کر نکالنے کا طریقہ ہے جس میں heat یا suction کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم طریقہ علاج ہے۔ یعنی جس طرح(leech) خون کو suck کرتی ہے اور فاسد مواد نکال کر اس جگہ کے زخم اور تکلیف کو دور کرتی ہے اسی طرح حجامہ بھی ہے۔ امام ابن قیم رقمطراز ہیں کہ پچھنا بدن کے سطحی حصے کو صاف اور ستھرا بناتا ہے۔''حجامہ سے جلد کے اطراف کا خون نکلتا ہے اور سطح بدن مواد ردیہ سے صاف ستھرا اور پاک ہوجاتا ہے۔''(صفحہ:۱۷) حجامہ کے بے شمار فوائد ملتے ہیں مثلاً یہ سر درد، مرگی، جوڑوں کے درد، ہر قسم کے زخم، ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، سانس کی بیماریوں کا بہترین ذریعہ علاج ہے(www.Hijamanation.com) لہٰذا ہمیں مختلف امراض کے علاج کے لئے سنت طریقوں کے بارے میں جاننے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف ہم بہترین صحت کے مالک بنیں اور دوسری طرف سنت پر عمل کر کے اجر بھی کمائیں۔

☆☆☆

بتول میگزین

غزل

عظمیٰ عمران۔لاہور

زیست کی تلخی سوا ہو جائے تو
مسکرانے کا بہانہ چاہیے
یہ خدا جانے اُنھیں کیا بیر ہے
دل دکھانے کا بہانہ چاہیے
دوریاں حائل رہیں تا زیست، اب
پاس آنے کا بہانہ چاہیے
منزلِ مقصود جب آئے قریب
لوٹ جانے کا بہانہ چاہیے
جومزااُن کے منانے میں ہے دوست
روٹھ جانے کا بہانہ چاہیے

☆☆☆

گواہی کے بدلے گولی

رافعہ صلاح الدین۔کراچی

حالات یہ ہیں کہ اب چاہے پارک میں کھیلنے آؤ یا ٹیکسی میں بچے کے ساتھ افطاری کا سامان لینے نکلو۔ مجرموں کی موج کا سامان بن جاؤ۔ مارو مر جانے دو .....آخر عوام کا تو کام ہی ہے مرنا.....بھوک سے نہیں تو گولی سے مر جاؤ ورنہ اگر تم حقیقت کا پردہ دنیا کے سامنے چاک کر رہے ہو تو بھی بے نام قبر میں جا سوؤ۔ یہاں عینی شاہد ہونا بھی ایک عذاب ہے گواہی کے بدلے گولی یہاں کا عام دستور ہے۔لب سی لو کہ یہاں الگ ہی دنیا آباد ہے۔جنگل کا قانون کہہ کر اُن بے زبانوں کی دنیا کو بدنام کیوں کریں ہم.....کہ ہم تو درندوں سے بھی بڑھ کر ہو چکے ہیں۔ پکڑ کا خوف جو نہیں، چاہے جتنے بھی سی سی ٹی وی کیمرے لگا لیے جائیں مجرم ہمیشہ کچھ پیسوں کے عوض چھوٹ جایا کرتے ہیں۔

ہم کیوں ریمنڈ ڈیوس کے معاملے میں احتجاج کرتے ہیں جبکہ خود ہمارے یہاں امیر تر طبقہ اپنی آل کو باآسانی صحت جرم اور اقبال جرم کے باوجود بچا لے جاتا ہے اور مجرم وکٹری کا نشان بنا کر ہمارے قانونی اداروں اور حکومتی مشینری کا مذاق اڑاتا ہے۔

ڈرون حملوں میں بے گناہ جانوں کا زیاں ہو رہا ہے۔ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دینے والے ہمارے حکمران لالچ و ہوس میں اتنے آگے بڑھ گئے

ہیں کہ بڑے سے بڑا سانحہ بھی ان کو ٹس سے مس نہیں کرتا ..... سانپ سیڑھی کے کھیل میں سب ایک سے ہیں جس کو سیڑھی مل جائے وہ حتی المقدور فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس بیچ رہ گئی عوام تو اس کو پٹرول، بجلی، آٹا، چاول کے بیچ الجھایا ہوا ہے۔ انٹرٹینمنٹ کے نام پر اس کو ایک نئی دنیا سے روشناس کروایا جا رہا ہے جہاں خاندانی اقدار تو ایک طرف ممنوعہ و حرام کاموں کو بھی اس ڈھنگ سے دکھایا جا رہا ہے کہ لوگ اس کو ٹھیک سمجھیں ..... مذہب کے نام پر مسلکی بنیادوں پر لڑوایا جا رہا ہے فرقہ وارانہ فساد جان بوجھ کر پیدا کیے جا رہے ہیں تا کہ عوام انہی کاموں میں مست رہیں اور حکومت بدمست ہاتھی کی طرح مگن۔

اب کہنا سننا سب کچھ بے کار ہے کہ یہ گونگے ہیں جو بے گناہ خون بہنے پر، اپنے سامنے ظلم و زیادتی ہونے کے باوجود دنیا میں ''تنہا'' رہ جانے کے خوف سے کچھ نہیں کہتے۔

یہ بہرے ہیں، ان کو غریبوں اور مظلوموں کی بے کس آوازیں نہیں آتیں کہ ہمدردی کے لیے یہ متاثرہ جگہ کا ہیلی کاپٹر سے دورہ کرنے کو بہت سمجھتے ہیں۔

اور یہ واقعی دھن کی چاہ میں اتنے اندھے ہو چلے ہیں کہ ان کو نظر ہی نہیں آتا کہ ملک و معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ یہ دولت و عشرت کی چاہ میں اتنے آگے چلے گئے ہیں کہ انھوں نے امریکی عدالت کے اس بیان پر صداقت کی مہر لگا دی ہے جو کہتی ہے کہ پاکستانی اتنے بے غیرت ہیں کہ ڈالر کے بدلے اپنی ماں تک کو بیچ دیں کہ انھوں نے ماں نہ سہی بیٹی تو ان کے حوالے کر کے مجرمانہ خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ بس اب انتظار اس بات کا ہے کہ کب دراز رسی تنگ ہوتی ہے ..... کہ اندھیری رات کا اختتام ہمیشہ روشن صبح سے ہوتا ہے۔

☆☆☆

یہ سرما کی ہوا

بسمہ انعم۔ کراچی

اے جانے والے، اے سمندر پار جانے والے بھیا! مجھے تمہیں کچھ بھیجنا ہے، کیسے بھیجوں؟ کیونکہ مشکل یہ ہے کہ نہ تو وہ Tcs ہوسکتا ہے نہ اس کی کاپی نکالی جاسکتی ہے اور نہ ہی کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ ارے میرے بھیا! اس کی تو ریکارڈنگ بھی نہیں ہوسکتی۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ آخر کون سی چیز ہے جو اس ٹیکنالوجی دور میں بھیجی نہیں جاسکتی؟

تم کہو گے کہ میں تمہیں پریشان کر رہی ہوں۔ اچھا چلو مجھے معلوم ہے میرا بھیا پرائے دیس، ہم گھر والوں سے دور بہتر مستقبل اور ملازمت کے لیے پہنچا ہے تو میں یوں پریشان تو نہ کروں۔ لیکن سچ بھیا ایک ایسی چیز ہے جسے میں محسوس تو بہت کر رہی ہوں لیکن تم سے کہہ نہیں پا رہی ہوں۔ اُف..... بڑے گن گاتے ہیں ہم اسکائپ، وائبر، واٹس ایپ اور فیس بک کے.....مگر ان سب کے باوجود یہ ممکن نہیں لگ رہا کہ تمہیں اپنے ساتھ موسمِ سرما کی بہاروں میں شریک کر سکوں گی پھر بھی کوشش کرتی ہوں۔

یہ جو موسمِ سرما کا ابھی آغاز ہوا ہے اپنے ساتھ سوغات میں خاموش، پراسرار سی ہوا ساتھ لایا ہے۔ یہ آخر کیسے بھیجوں؟ اس موسم کا احساس ایسی شدت سے پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا۔ بھیا! کیسی عجیب ہوتی ہے سردی کی ہوا۔ خاموش سی لیکن اگر تم سنو تو رات کے سناٹے میں لگے گا کہ ہوا کے ساتھ دھیما سا شور ہے جس سے تمہارے سر میں درد نہیں ہوگا جیسے کہ تمہیں اکثر یونیورسٹی سے واپسی پر ٹریفک سے ہو جاتا تھا اور سردی کی آمد پر بھی تمہیں سر درد کی شکایت ہو جاتی تھی۔

اور ہاں بھیا..... ایک خوشبو بھی ساتھ ہوتی ہے، سرد ہوا کے جھونکے میں..... سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیسی ہوا کی بات کر رہی ہوں؟ اصل میں بھیا! اتنی گہرائی سے، اتنی شدت سے موسم کو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ میں اور تم گھر میں تو ہر وقت اپنی باتوں کی محفل سجائے رہتے تھے۔ دنیا جہاں کے قصے اور مستقبل کی باتیں۔ اب جو اتنی خاموشی ہوئی تو مجھے ہر احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس سرد موسم میں کیا کیا رنگ چھپے ہیں یہ مجھ پر کھل رہا ہے۔ تو تم سمجھ رہے ہو نا کہ ہوا یہ ہی ہوتی ہے ہمارے اردگرد ایک سی لیکن وہ ہر کسی پر مختلف طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

اچھا اب تم سوچو اس خوشبو کو جو پورے ماحول میں گھلی ہے..... جیسے چند بوندیں مٹی پر گری ہوں اور اسی لمحے خوشبو پھوٹ پڑی ہو۔ ہو بہو وہی خوشبو، بھینی بھینی سی چاروں اور پھیلی ہوئی ہے۔

پھر کالی سیاہ رات.....خوش نما سا اندھیرا جس میں کسی قسم کے خوف کا عنصر نہیں، جس میں تم مجھے ڈرانے کی کوشش کرو گے بھی تو میں ڈروں گی نہیں..... تمہیں سمجھانے کو اس سے بہتر مثال مجھے نہیں ملی۔

ارے بھیا! بادلوں کا حال تو سنو۔ ایسے ہی کالے بادل جنہیں دیکھ کر خوف محسوس نہیں ہوگا بلکہ جب ان

کے بیچ اجلا اجلا، نکھرا نکھرا چاند دیکھو گے تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔

یہ کالی پرسکون رات، نم نم سے جھونکے، سرد ہوا کا دھیما سا شور، فضا میں نرم سی خوشبو..... یہ میرے احساسات ہیں جو تم کو بھیجنا چاہتی ہوں۔ میں ہرگز تمہیں موسم کی رپورٹ نہیں دے رہی اور نہ ہی منفی ڈگری کی اطلاع دے رہی ہوں بلکہ تمہیں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ تمہارے دور دیس جانے کے بعد پہلی موسمِ سرما کی آمد میں میں نے اکیلے ٹیرس پہ بیٹھ کے کیا محسوس کیا اور ساتھ ہی تمہیں بہت یاد کیا۔ پھر اللہ رب العزت سے دعا کی کہ میرے بھائی کو دن دُگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور چاند تاروں اور خوشبو بھری ہواؤں سے کہا کہ تم سب آمین کہو۔

اب تو سمجھ گئے نا بھیا؟ چلو جب سرد ہوا کا جھونکا تمہارے آفس کی شفاف سی کھڑکیوں سے ٹکرائے تو شیڈز ہٹانا اور دیکھنا تمہیں اس میں چھپا روئی کے گالے جیسا مسکراتا ہوا پیغام ملے گا جو بڑی میلوں کا سفر طے کر کے سرحد پار سے آیا ہے اور تمہاری بہن نے بڑے مان سے بھیجا ہے۔ اپنے احساسات کا تحفہ.....

☆☆☆

میرے مولا

(حیا قاسمی۔ کراچی)

بھولی نہیں ہوں تجھ کو
ہے یاد مجھ کو اب بھی
میرے لاشعور میں ہے
تیرا ساتھ اب بھی مولا
دنیا کی بھیڑ میں جو
رنگوں کی کہکشاں ہے
یہ رونقِ جہاں ہے
اُکتا کر ان سبھی سے
بس تجھ کو ہی پکاروں
تنہا جو خود کو پاؤں
اخلاص کو وفا کو
جب دوستوں میں ڈھونڈوں اور ڈھونڈ کر نہ پاؤں
تب یاد تو ہی آئے
تیرا ذکر دل کو بھائے
اذہان میں اُجالا
تیرے نام سے مولا
میرے لاشعور میں ہے
تیرا ساتھ اب بھی مولا

☆☆☆

بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کے نام

امریکا سے تعلق رکھنے والے Pew Research Center (جس کی رپورٹس کو عمومی طور پر دنیا بھر میں اہمیت دی جاتی ہے) کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق سات مسلم اکثریتی ممالک بشمول پاکستان، مصر، سعودی عرب، ترکی، ایران، لبنان اور تیونس میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق پاکستان میں اٹھانوے فیصد (98%) افراد گھر سے باہر نکلتے وقت عورت کو پردہ کی کسی نہ کسی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ صرف دو فیصد افراد ننگے سر عورت کے باہر نکلنے کے حامی ہیں۔ تفصیلات کے مطابق پاکستان میں رہنے والوں کی سب سے بڑی تعداد بتیس فیصد (32%) عورتوں کے حجاب (سعودی برقعہ جس میں صرف آنکھیں نظر آتی ہیں) لے کر گھر سے نکلنے کے حامی ہیں۔ اکتیس فیصد (31%) پاکستانیوں کے رائے میں عورت کو ایرانی طرز کا برقعہ (جس میں چہرہ کا پردہ نہیں ہوتا) پہن کر گھر سے باہر نکلنا چاہیے۔ چوبیس فیصد (24%) پاکستانیوں کے رائے میں عورت کو کم از کم اسکارف پہن کر گھر سے نکلنا چاہیے۔ آٹھ فیصد (8%) پاکستانیوں کی رائے میں سر پر دوپٹہ لپٹ کر عورت کو گھر سے باہر نکلنا چاہیے جبکہ دو فیصد (2%) کے خیال میں افغانی برقعہ پہن کر گھر سے باہر نکلنا چاہیے۔ پاکستان میں صرف دو فیصد افراد عورتوں کو بغیر سر پر دوپٹہ لیے باہر نکلنے کے حامی ہیں جبکہ ایسی تعداد سعودی عرب میں تین فیصد، عراق میں چار فیصد، مصر میں چار فیصد، تیونس میں پندرہ فیصد، ترکی میں بتیس فیصد اور لبنان میں سب سے زیادہ 49 فیصد ہے۔ یاد رہے کہ لبنان میں تقریباً چالیس فیصد کرسچن رہتے ہیں جبکہ وہاں مسلمان تقریباً 54 فیصد ہیں۔ اس سروے کے مطابق لبنان کے 51 فیصد لوگ جبکہ باقی مسلمان ممالک کی واضح اکثریت (پاکستان 98 فیصد، سعودی عرب 97 فیصد، ترکی 68 فیصد، عراق 97، مصر 96 فیصد، تیونس 85 فیصد) پردہ کی کسی نہ کسی حد کے ساتھ عورت کے باہر نکلنے کے حامی ہے۔

اس سروے نے ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کی اسلام اور اسلامی شعار سے محبت کو ثابت کیا مگر افسوس کہ پاکستان کا میڈیا اس سروے رپورٹ کو ہی پی گیا۔ میں

نے اس رپورٹ کی خبر کسی اخبار میں پڑھی اور نہ ہی کسی ٹی وی چینل پر سنی۔ ٹاک شوز میں تو اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ ذکر بھی کیوں ہوتا اس سے ریٹنگ تھوڑے ہی ملتی ہے۔ ریٹنگ تو ایسے سروے سے ملتی ہے جو فحش افراد کے متعلق ہو، جو فحاشی کو پھیلائے۔ ویسے تو ہر گھٹیا سروے کی خبر ہمارے میڈیا کو مل جاتی ہے مگر PEW کے اس سروے سے ہم کیوں اس قدر بے خبر رہے۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل PEW کا ایک اور سروے جس میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اسلامی قوانین اور شریعت کے نفاذ کے حق میں بات کی تھی، وہ بھی عمومی طور پر ہمارے میڈیا کو نظر نہیں آیا۔ میں حیران ہوں اگر میڈیا کو کسی اداکارہ یا ماڈل کی اس کے فیس بک پر فحش تصویریں چینلز پر چلانے اور اخبارات میں چھاپنے کو مل جاتی ہیں تو یہی میڈیا وہ سچ دیکھتے وقت کیوں اندھا ہو جاتا ہے جو اسلامی سوچ کے حق میں ہوتا ہے۔ اس سروے اور میڈیا کے کردار سے ہماری بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مغربی کلچر اور اس سے متاثر ہمارا میڈیا عورت کی عزت اور اس کی حرمت کو تار تار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ عورت کو پیسہ کمانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے بے لباس بھی کیا جا رہا ہے۔ اب تو عورت کو نمائش کے طور پر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی انسانی و نسوانی حقوق کے نام پر اور کبھی برابری کے نام پر بیچاری عورت کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ویسے تو عورت کو جائیداد میں حصہ دیا جاتا ہے اور نہ ہی اس سے نرمی اور احسن طریقہ سے سلوک کیا جاتا ہے جس کی تعلیم ہمیں اسلام نے دی مگر آزادی، حقوق اور برابری کے نام پر عورت بیچاری کا خوب استحصال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عورتوں کے لباس کی ایک حد مقرر کر دی ہے جو فرض کے زمرے میں آتی ہے۔ مثلاً گھر سے باہر نکلتے وقت مومن عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اوپر اوڑھنیاں (جس کے لیے قرآن کریم میں جلابیب کا لفظ استعمال ہوا ہے) گرا لیں، جو نہ صرف ان کی پہچان کا ذریعہ ہو بلکہ انہیں تحفظ بھی فراہم کرے۔ اسی طرح بناؤ سنگھار کر کے گھر سے باہر نکلنے کی اسلام نے سخت ممانعت کی ہے اور اسے دورِ جہالت کا رواج قرار دیا ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی نظروں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

(روزنامہ جنگ لاہور 15 جنوری 2014ء)

☆☆

صلی اللہ علیہ وسلم

جب ستارے جگمگاتے ہیں، پھول مسکراتے ہیں، بادل پانی برساتے ہیں۔ جب بھی بادِ صبا سرسراتی ہے، سورج روشنی کا پیغام لاتا ہے، کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ جب بھی ہر نیا موسم، نیا پھل لے کر آتا ہے۔ جہاں بھی اک نیا انسان دنیا میں امید کا دیا جلانے آتا ہے.....تو مجھے میرا رب یاد آتا ہے۔

ساتھ ہی اس پیارے بندؑے کی یاد دل کو گرماتی ہے جس نے مجھے اپنے رب کے ساتھ قرب کا احساس دلایا.....

پھر مجھے اپنے رب پہ اور بھی پیار آتا ہے کہ اس نے اپنا پیارا بندہؑ میرے لیے اپنی پہچان اور تعارف کے لیے دنیا میں بھیجا۔ میرے لیے میرا ربّ کتنا مہربان ہے اور مجھے دل کے نہاں خانوں میں روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے کہ میرا محبوب وہ ہے جو اللہ رب العالمین کا محبوبؐ ہے۔ میرا ربّ کتنا عظیم ہے کہ اس نے اپنے اور میرے لیے ایک ہی محبوبؐ کو پسند فرمایا۔ مجھے آسمانوں پہ فرشتوں کی صدا سنائی دیتی ہے، وہ اس محبوبؐ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ آسمان سے زمین تک کائنات کے ہر ذرّے میں ایک ہی احساس ہے۔ رب العالمین خود فرشتوں کے ہمنوا ہے۔ میری خوش نصیبی کہ اس میں میری بھی آواز شامل ہے۔ ہر طرف ایک ہی آواز ہے، ایک ہی احساس محبت ہے ﷺ.....ﷺ۔ جب بھی معصوم سی دلہن پیا دیس جاتی ہے۔ جہاں بھی پیا دیس میں اس دلہن کے لئے ہر آنکھ محبت کا دیا بن جاتی ہے۔ جب کہیں شوہر بیوی کو ''آبگینہ'' سمجھ کر سنبھال کر احتیاط سے رکھتا ہے کہ اس ''آبگینے'' کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ اور جب کہیں بیٹی کی پیدائش پر باپ کے چہرے کی رونق دیکھتی ہوں، جب کسی باپ کی دل سے اٹھتی آواز سنتی ہوں۔ ''میری بچی، میری لخت جگر، میری آنکھوں کی ٹھنڈک.....'' تو میرا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ ﷺ.....ﷺ۔

جب کہیں میں بھائیوں کو بہنوں کا سائبان بنا دیکھتی ہوں۔ جب کہیں زمانے کی ٹھکرائی بہن بیٹی کے

لیے باپ بھائی کے گھر اوردل کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ جب بھی کہیں دکھ کی صلیب پہ لٹکی عورت کے لئے محرم رشتوں کے بازو حصار بنتے ہیں۔ بڑھاپے کی دہلیز پہ بیٹھی ماں جب حوصلے اورسہارے کی رِدا اوڑھے بیٹھی ہوتو میرا ایمان بڑھتا ہے اور میرا دل کہتا ہے ﷺ.....ﷺ۔

میں جہاں بھی کچھ اچھا دیکھتی ہوں، پڑھتی اورلکھتی ہوں، جب بھی کہیں حق کی آواز سنتی ہوں، انقلابِ حق کی چاپ کانوں میں پڑتی ہے، شہیدوں کے لہوں کی مہک سے فضا معطر پاتی ہوں، کرۂ ارض پر ''حق آ گیا، حق آ گیا'' کی نوید کا احساس رگ وپے کو حیات نو بخشتا ہے تو میرا دل، میرا شعور، میرا ذہن، میری ہر سانس، میرے دل کی دھڑکن پکار اٹھتی ہے ﷺ.....ﷺ۔

☆☆☆